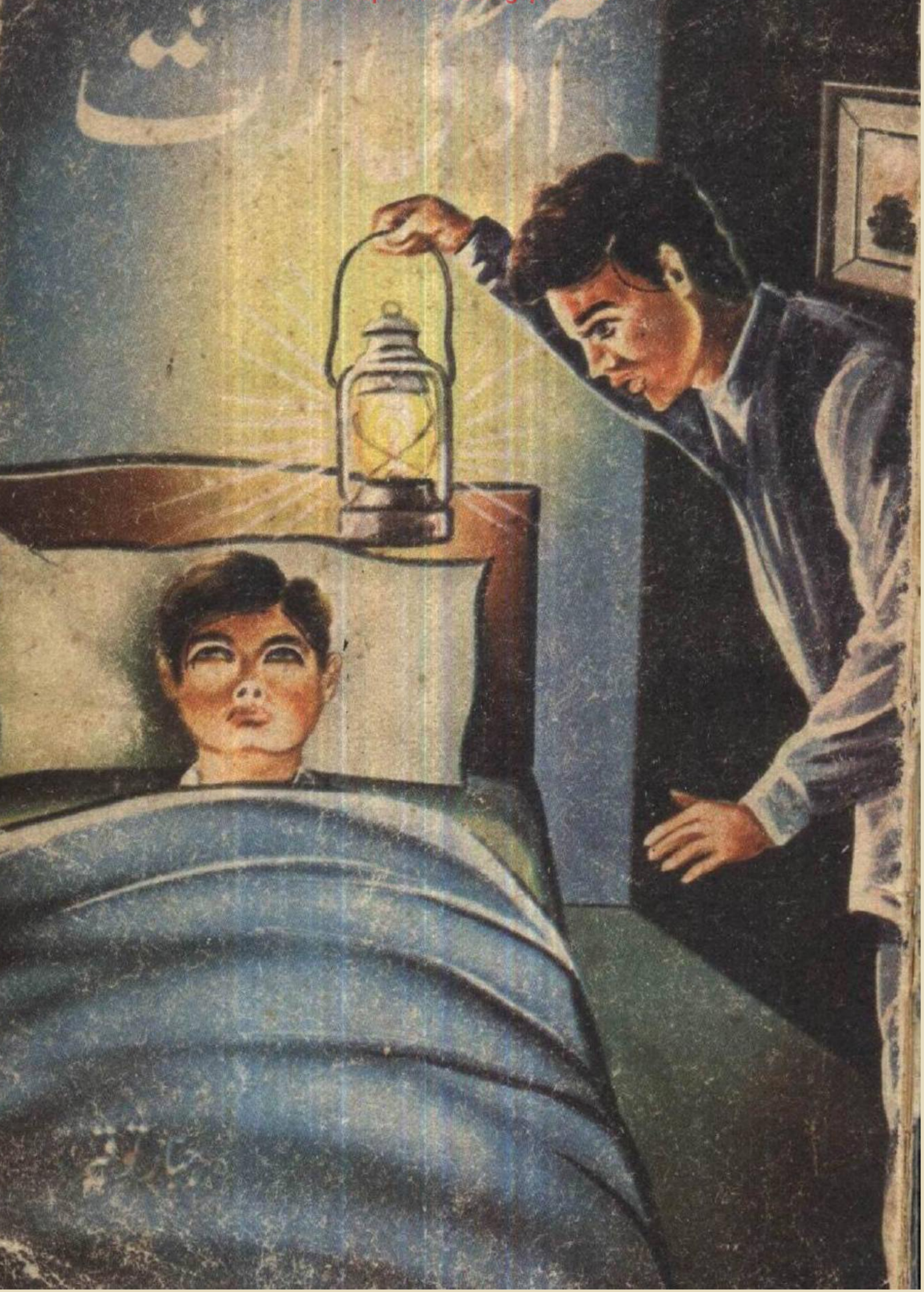
allurdupdfnovels.blogspot.com



بچّوں کے لیے ناول

آدھی رات

جبّار توقیر

شیخ غلام علی اینڈ سنز

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز لاہور

اشاعت اول : ۲۰۰۰

قیمت : ۴۔ ۵۰ روپے

مقام اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

ادبی مارکیٹ چوک انار کلی لاہور

۱

اِن دنوں میں گورنمنٹ ہائی سکول کے ہاسٹل میں رہتا اور نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ میرے دِن بڑے مزے سے گزر رہے تھے کہ اچانک سب کُچھ اُلٹ پلٹ ہو کر رہ گیا۔ اس رات گھڑی نے دس بجائے تو سب لڑکوں کے سرہانے جلتی ہوئی بتّیاں ایک ایک کر کے بُجھنے لگیں۔ میں نے بھی اپنی کتابیں بند کر کے میز کی دراز میں رکھ دیں اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ یہاں سے وہاں تک آہستہ آہستہ مکمّل خاموشی چھا گئی۔ ہاسٹل کا وہ ہال ہسپتال کے وارڈ سے بھی زیادہ وسیع معلوم ہوتا تھا۔ وہاں پینتیس

لڑکے رہتے تھے۔ قطار اندر قطار اُن کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ ہر بستر کے سرہانے ایک میز تھی جس کے نیچے ہر لڑکا اپنا ٹرنک رکھتا تھا۔ میز کی دو درازیں ہوتی تھیں۔ اُن میں کتابیں رکھی جاتی تھیں۔ حُکم یہ تھا کہ ہم ہر شے کو ہر وقت بڑے قرینے سے سجا کر رکھیں۔ میز نوش صاف ستھرا ہو۔ اس پر اگر کوئی پھول دان رکھ دے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے بڑی شاباش دیتے تھے۔ ان کا نام ترمزی صاحب تھا۔ وہ رات کو دس بجے سارے کمروں میں ایک چکّر لگانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔

اس رات جب میں لحاف اوڑھ کر بستر میں لیٹا تو معلوم ہوا کہ نیند مُجھ سے کوسوں دور ہے۔ دراصل اس شام میں معمول سے زیادہ چائے پی گیا تھا اور چائے مُجھے کسی طرح بھی راس نہ آتی تھی۔ سب لڑکے سو چُکے تھے۔

اور میرے دائیں بائیں بستروں میں سے خرّاٹوں کی آوازیں بُلند ہو رہی تھیں مگر مُجھے نیند نہ آ سکی۔ عبدل باورچی سے خُدا سمجھے وہ ایسی تیز چائے بناتا تھا کہ اُسے پی لینے کے بعد آدمی کو صدیوں تک نیند نہیں آ سکتی تھی۔ گیارہ بج گئے۔ گھڑی کی سوئیاں دو گھڑی کے لیے ٹک ٹک ٹنان کر کے آگے بڑھ گئیں۔ لیکن میں ابھی تک نہ سو سکا تھا۔ ساڑھے گیارہ ہوئے پھر بارہ بج گئے مگر میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ ہال کی مشرقی دیوار میں صرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں سارا ماحول بڑا پُراسرار نظر آتا تھا۔ بارہ بج گئے۔ سوئیاں پھر آگے چل دیں۔ مُجھے تو اس رات خُدا جانے کیا ہوا۔ کسی طرح آنکھ لگتی ہی نہ تھی۔ ساڑھے بارہ بجے پھر ایک بھی بج گیا۔ رات کتنی تیزی سے گزرتی جا رہی تھی مگر مُجھے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک عجیب سا خُون میرے ذہن پپر طاری ہونے لگا۔ میری آنکھیں بُری

طرح جل رہی تھیں۔ مُجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں قبرستان میں لیٹا ہوں اور میرے ارد گرد جتنے لڑکے لیٹے ہوئے ہیں وہ زندہ نہیں بلکہ مر چُکے ہیں۔

اچانک مُجھے باہر باغ کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میرا دِل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ پھر ایک لمحے کے بعد دوسری گولی چلی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک آواز فضا میں اُبھری جیسے کسی کے حلق پر چھُری پھیری جا رہی ہو مگر وہ چیخ کسی جانور کی معلوم ہوتی تھی۔ خوف کی وجہ سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہونے لگیں۔

یہ گولی کسی نے چلائی ہے ؟

کون ہے جس نے کسی کو مار دیا ہے ؟

یہ کس کی چیخ تھی؟

سب لڑکے سوئے ہوئے تھے۔ کسی نے بھی وہ آواز نہ سُنی تھی۔ کوئی بھی نہ جاگا تھا۔ سب کے سب گہری نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ کوئی دس منٹ تک میں خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا چھت کو گھورتا رہا۔ اچانک ہاسٹل کا آخری دروازہ بڑی آہستگی سے کھُلا۔ خوف کی وجہ سے میری تو گھِگّی بندھ گئی۔

کون آیا ہے؟

رات کے ایسے خوف ناک لمحے میں ہاسٹل کا دروازہ کھول کر کون اندر آ سکتا ہے؟

میں نے لیٹے لیٹے بڑے غور سے دیکھا تو کوئی شخص کمبل اوڑھے دبے

دبے قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کیا اور پھر وہ اسلم کے بستر کی طرف بڑھا۔ وہاں پر جو میں نے نظر ڈالی تو پائنتی سے تکیے تک لحاف لمبا رکھا ہوا تھا۔ اس شخص نے کمبل اُتار کر پائنتی پر رکھا تو میں حیران رہ گیا۔

وہ اسلم تھا۔

نویں جماعت کا لڑکا۔

ارے یہ کہاں سے آیا ہے اس وقت، کمال ہے؟

میرا جی چاہا میں اسے آواز دے کر پوچھوں مگر ہمّت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میری آواز سے سب لڑکے جاگ اٹھیں گے۔ اسلم بڑی خاموشی سے لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے خرّاٹوں کی آواز

دور دور تک سُنائی دینے لگی۔ اسے نیند بہت پیاری تھی۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی بھی اتنی دیر تک ہاسٹل سے غیر حاضر نہ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں سے آیا ہے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ سینما دیکھ کر آیا ہو کیوں کہ اس کی عادتیں ایسی ہی تھیں وہ سیدھا سادھا لڑکا نہیں تھا۔ پھر بھی ہاکی کا اچھّا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے ہم سب اس کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ دیر تک میں انہی خیالات میں گُم رہا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ وہ گولی کیوں چلی ہے اور اسلم آدھی رات کے بعد کہاں سے آیا ہے۔ وہ میرا دوست تھا اور کئی بار مُجھے رات کو سینما دیکھنے کی دعوت بھی دے چکا تھا مگر رات کے وقت اس کے ساتھ مُجھے ہاسٹل سے باہر جانے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔

صُبح کے تین بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد مُجھے کوئی ہوش نہ رہا کہ

میں کہاں ہوں۔ اچانک کسی نے مُجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

میرے سامنے ترمزی صاحب کھڑے تھے۔ ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ۔ اس وقت صُبح کے سات بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے بولے: "اٹھو بھئی اٹھو تُم سب کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے بُلایا ہے۔"

میں لحاف الگ پھینک کر تیزی سے اٹھا اور اور اپنا تولیہ اور برش لے کر غُسل خانے کی طرف بھاگا۔

وہاں ارشد اور اجمل کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہاسٹل میں کُل سولہ غُسل خانے تھے اور وہاں ایک سو دس لڑکے رہ رہے تھے۔

مُجھے دیکھتے ہی اجمل بولا:

"یاد یہ کیا قصّہ ہے۔ رات کسی نے جیپسی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔"

"ارے تقی صاحب کے کُتّے کو مار دیا کسی نے؟"

میں نے حیران ہو کر کہا۔

تقی صاحب ہمارے ہیڈ ماسٹر کا نام تھا۔ سب اُنھیں تقی صاحب ہی کہتے تھے۔

"اچھّا ہوا یار۔ اِس جیپسی نے تو ہم سے سینما بھی چھڑا دیا تھا۔ ہاسٹل کے دروازے پر تو تقی صاحب کا مکان ہے۔ جیپسی کسی کو باہر ہی نہ نکلنے دیتا تھا۔"

ارشد نے کہا۔

"بڑی اچھّی نسل کا کتّا تھا وہ۔ میرا خیال ہے تقی صاحب اسی لیے لڑکوں کو بلا رہے ہیں۔" اجمل نے کہا۔

"اُنہیں لڑکوں پر شک ہو گا کہ اُنہی میں سے کسی نے اس پر گولی چلائی ہے۔ "ارشد ہوں۔

"ہم پر وہ کِس طرح شک کر سکتے ہیں۔ ہم کوئی بندوقیں لیے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ ہم سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"ارشد نے کہا۔

"پتہ ہے پچھلے مہینے جلیبی نے خالد کی ٹانگ اُدھیڑ دی تھی اور اُس کے ابّا کتنے ناراض ہوئے تھے۔ کہتے تھے جلیبی کو گولی مار دیں گے۔" اجمل بولا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ خالد کے ابّا آکر اسے گولی مار گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ارے بھئی مُجھے کیا پتہ کس نے یہ کام کیا ہے اور تقی صاحب کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" اجمل نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھّا تُم جلدی جلدی ہاتھ مُنہ دھولو پھر دیکھتے ہیں کیا قصّہ ہے۔" راشد بولا۔

تین غُسل خانے خالی ہوئے تو ہم جا گھُسے۔ تھوڑی دیر بعد ہم تیّار ہو کر ناشتے کے لیے ٹفن روم میں جا پُہنچے۔ وہاں بھی جبسی کی موت کا ذکر ہو رہا تھا۔

کھانے کی میز پر جب ہم بیٹھے تو پانچویں کُرسی پر مُجھے اسلم نظر آیا۔ وہ بڑی بے دِلی سے لُقمے اٹھا رہا تھا اور سخت پریشان نظر آتا تھا۔ خالد بھی چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب لڑکے بڑے زور شور سے جبسی کی موت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں نے اسلم کی طرف ذرا غور سے دیکھا تو ایک لحظے کے

لیے میری اُس کی نگاہیں ملیں۔ ایک پھیکی سی مُسکراہٹ اُس کے لبوں پر اُبھری اور پھر اُس نے نظریں جھُکالیں۔ تب مُجھے معلوم ہواکہ سارا قصور اسلم کا ہے۔ اسی نے جیپسی یہ گولی چلائی ہوگی۔ وہ بھی جیپسی کے دانتوں کا مزہ دیکھ چکا تھا۔ اُسے سینما دیکھنے کی لت تھی۔ وہ ایک ہفتہ پہلے رات کو بارہ بجے جب سینما دیکھ کر واپس آیا تھا تو جیپسی نے اس کی پتلون ہی پھاڑ دی تھی۔ ہاسٹل کا دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا اور اسلم جب بھی رات کو باہر جاتا واپسی پر چوروں کی طرح کھڑکیوں پر پاؤں جا کر چھت کے راستے اندر آتا تھا۔ وہ ساری باتیں مُجھے بتادیا کرتا تھا اور میں کہتا تھا :

"اسلم کسی دِن تو پکڑا گیا تو تقی صاحب تیرا بار بار کہ حلیہ بگاڑ دیں گے۔"

مگر وہ کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ امیر آدمی کا بیٹا تھا۔ گھر سے پیسے اُسے وافر مل جاتے تھے جس کی وجہ سے اُس کی عادتیں خراب ہوتی جارہی تھیں۔

اُس کی پریشانی دیکھ کر مُجھے یقین ہوگیا کہ یہ سارا کیا دھرا اُسی کا ہے۔ اس کے باپ کے پاس ایک ولایتی پستول تھا جسے ایک دفعہ وہ گھر سے چوری چھُپے اُٹھا کر ہاسٹل میں لے آیا تھا۔ کئی لڑکوں کو اُس نے وہ پستول دِکھایا۔ پھر وہ ہمیں اپنی نشانہ بازی دکھانے کے لیے باہر کھیتوں میں لے گیا۔ وہاں اس نے تین گولیاں چلا کر ہمیں حیران کر دیا۔ بولا:

"ہم پٹھان ہیں اور بندوق پستول چلانا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

اس کی یہ ساری باتیں مُجھے اچھّی طرح یاد تھیں مگر مُجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دِن وہ غُصّے میں آ کر جیپی کو ہی ختم کر دے گا۔ مُجھے اس سے ایک نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ مُجھے یوں لگا جیسے وہ کسی دِن میری کسی بات پر ناراض ہو کر مُجھ پر بھی گولی داغ دے گا۔ میں نے سوچا اب میں اس سے کبھی نہیں بولوں گا خواہ کُچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کھانا کھا کر جب ہم واپس آئے تو ہاسٹل کی چوکور عمارت کے صحن میں تقی صاحب نے ہمیں روک لیا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ ترمزی صاحب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اُنھوں نے ہاسٹل کے تمام لڑکوں کو وہاں جمع کر رکھا تھا۔ دس گیارہ لڑکے غیر حاضر تھے۔ باقی سب کے سب وہاں تقی صاحب کے سامنے کھڑے تھے۔ تقی صاحب نے تمام لڑکوں کو بڑے غور سے دیکھا اور بولے :

"رات کسی نے ہمارے جیپی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ گولی کی آواز سُن کر ہمارا نوکر اصغر اسی وقت باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کوئی شخص اس ہاسٹل کی کھڑکیوں کی راہ سے چھت پر چڑھ رہا تھا۔ وہ اسے روکنے کے لیے کھڑکی کے قریب آیا تو اس آدمی نے ہمارے نوکر پر گولی چلا دی۔ اصغر اِس گولی سے بال بال بچا اور خوف زدہ ہو کر گھر میں گھُس گیا۔ پھر اس نے

ہمیں جگایا مگر اس وقت تک وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے سارا ہاسٹل چھان مارا مگر وہ آدمی ہمیں کہیں نہیں ملا۔ تُم میں سے کسی لڑکے کو اگر کُچھ معلوم ہو یا کسی نے کسی اجنبی کو ہاسٹل میں پھرتے دیکھا ہو تو وہ مُجھے بتا دے۔ اصغر کا خیال ہے کہ گولی کسی لڑکے نے چلائی ہے کیونکہ اس آدمی کا قد کاٹھ سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر تقی صاحب چُپ ہو گئے۔ اب ہم سب ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ دیکھ رہے تھے۔ سب لڑکے خاموش تھے۔ تقی صاحب کے سوال کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ترمزی صاحب سامنے کھڑے ایک ایک کا چہرہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹول رہے تھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تقی صاحب بولے:

"چھت پر کسی لڑکے کے جوتوں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ وہ لڑکا

جو رات کو ہاسٹل سے غائب رہا اور بے وقت اندر آیا، یا وہ لڑکا جو چھت کی راہ نیچے اُترا آپ ہی آپ باہر آ جائے۔"

یہ سوال سُنتے ہی میں نے کُچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا تو اسلم نے ایک دم مُجھے کُہنی ماری جس کا مطلب تھا کہ میں بالکل خاموش رہوں۔ لڑکے ایک بار پھر حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تقی صاحب کے اس سوال کا جواب بھی کوئی نہ دے سکتا تھا لیکن مُجھے معلوم تھا کہ کون کیا کرتا رہا ہے مگر میں نے سوچا ہو سکتا ہے میرا اندازہ غَلط ہو۔ اسلم اس وقت پاخانے کے لیے باہر گیا ہوا ہو۔ میرے پاس اِس بات کا تو کوئی ثبوت نہ تھا کہ اسلم ہی چھت پھاند کر نیچے آیا تھا۔

"میری اِس بات کا بھی تُم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بہت ہی بُری بات ہے مگر یاد رکھو ہم اس لڑکے کو ضرور ڈھونڈ لیں گے اور پھر ہم اسے

ایسی سزا دیں گے کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا۔"

اب کی بار پھر میرا ارادہ ہوا کہ میں اسلم کا نام بتا دوں مگر اسلم نے بڑے زور سے میرا پاؤں دبایا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں بالکل چُپ رہوں۔ اسے آپ ہی آپ یہ احساس ہو چکا تھا کہ میں نے رات کو اسے ہاسٹل میں گھُستے دیکھ لیا تھا کیونکہ صُبح سے جتنی بار بھی میری اس کی نظریں ملی تھیں وہ گھبرا کر مُنہ پھیر لیتا تھا اور اب تک مُجھے اس سے علیحدگی میں کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اسلم کے اشارے پر اب کی بار بھی میں خاموش رہا۔ آخر کو وہ میرا دوست تھا۔ اگر اس نے بدلہ لینے کے لیے کُتّے کو مار دیا تھا تو بھی میں اسے بُرا نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کُتّے سے ہم سب عاجز آ چُکے تھے۔

تقی صاحب کا بنگلہ نما مکان ہاسٹل کی عمارت کے بالکل سامنے تھا اور

جبسپی سارا دِن بیچ سڑک کے کھڑا پہرہ دیتا تھا۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی پرندہ بھی وہاں پر مار سکے۔ وہ شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش تھا۔ جس کسی کے تیور اسے بدلے ہوئے نظر آتے تھے وہ اسی کے کپڑے لئے پھاڑ پھوڑ کر ٹانگ کا گوشت ادھیڑ دیتا تھا۔ خالد بے چارا تو کئی دِن بیمار رہا تھا اور اس کے باپ کا غصّہ بجا تھا۔ مگر تقی صاحب اپنے اس لاڈلے کُتّے کو دوپہر ہوتے ہی کھول کر آزاد کر دیتے تھے کہ جا بچّہ جس کسی کی چاہے بوٹی کاٹ کر کھا لے، تُجھے سات خُون معاف، کوئی تُجھے کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ تقی صاحب کا کتّا راجہ کے ہاتھی کی طرح اینڈتا پھرتا تھا۔ اچھّا ہوا جو کسی نے اُسے جہنّم رسید کر دیا تھا۔ اگر اسے اسلم نے گولی ماری تھی تو اور بھی اچھّا کیا تھا۔ وہی اس بلا سے ہماری جان چھڑا سکتا تھا اور کس میں اتنا کَس بَل تھا کہ وہ اتنے دِل گردے سے رات کے

اندھیرے میں تاک کر جیسی پر گولی چلا سکتا۔ پہلی بار مُجھے محسوس ہوا کہ اسلم نے بہت ہی نیک کام کیا ہے۔ بڑا ہی پلید اور خونخوار کتّا تھا وہ۔

تقی صاحب نے اب قتل کا مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ میں نے سوچا اُنہیں اور ان کے مہمانوں کو خُدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُن کے سر سے بلا ٹلی کیونکہ اس سے ایک دِن پہلے تقی صاحب کی بیٹی اپنے دو بچّوں اور خاوند کے ہمراہ کویت سے آئی تھی۔ وہ بے چارے جب دروازے پُہنچے تو جیسی سرکار کو ایسا تاؤ آیا کہ اُس نے تقی صاحب کی بیٹی کی ساڑھی نوچ ڈالی۔ اُس بیچاری نے گھبرا کر اپنا بھاری بھرکم پرس جیسی کے سر میں دے مارا تو وہ پرس جھٹکا لگنے سے آپ ہی آپ کھُل گیا اور ڈھیر سارے چمکتے چمکتے زیورات اور کتنے ہی نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ وہ تو اچھّا ہوا کہ تقی صاحب کی بیوی باہر نکل آئیں جِن کے آگے آگے اصغر

تھا۔ اُنھوں نے جیپسی کو پکڑ کر رام کیا ورنہ وہ کم بخت تو خُدا جانے کتنا خُون بہا دیتا۔ کتنی ہی دیر تک وہ لوگ دروازے کے باہر کھڑے زمین پر سے زیورات اور موتی اور نگینے چُنتے رہے۔ دو چار نوٹ تو میرا خیال ہے تیز ہوا میں ویسے ہی اُڑ گئے تھے۔ تو یہ تھا جیپسی جس کے قتل کا مقدمہ اُس روز کھڑا ہوا تھا۔ تقی صاحب سخت غُصّے میں تھے۔ وہ لڑکوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اب تک اُن کی کوئی پیش نہ چل سکی تھی کیونکہ ترمزی صاحب بار بار اُنھیں سمجھا رہے تھے کہ یہ اُن کا وہم ہے۔ اسکول کا کوئی لڑکا رات کو باہر نہیں نکلا تھا۔ سب لڑکے ہاسٹل کے اندر بیٹھ کر دس بجے تک پڑھتے رہے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ترمزی صاحب رات کو دس بجے جب ہاسٹل کا چکّر لگا کر واپس گئے ہیں تو اس وقت تمام لڑکے اپنے اپنے بستروں پر موجود تھے۔ ایک طرح سے اسلم

بھی وہیں تھا۔ کیونکہ اس کا لحاف کُچھ اِس طرح لمبا پڑا تھا اور اس میں تکیہ کُچھ اس طرح رکھا ہوا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ بستر پر اسلم سو رہا ہے۔ اب ہمیں خواب تھوڑا آیا تھا کہ اسلم وہاں موجود نہیں ہے اور ترمزی صاحب کوئی ولی تھوڑے تھے کہ آپ ہی آپ سمجھ سکتے کہ کسی لحاف میں لڑکا ہے اور کسی لحاف میں تکیہ۔

بے چارے تقی صاحب پر البتّہ مُجھے بہت ترس آتا تھا کیونکہ اُنھوں نے جلپسی کو اپنے بچّوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ پچھلے تین چار سال سے تو میں اِس کُتّے کو اُن کے دروازے پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے بازار سے خاص طور پر الگ گوشت منگواتے تھے۔ اصغر کو اس کی نگہداشت کی بار بار تاکید کرتے تھے۔ لے دے کر ایک ہی تو شوق تھا اُن کا۔ مگر اسلم نے وہ شوق بھی تباہ کر دیا۔ وہ رات کو دروازے پر شیر کی طرح پہرہ دیتا۔ ذرا

سی آہٹ ہوتی تو جیپسی زمین سے دو دو ہاتھ اُوپر اُچھل اُچھل کر بھونکنے لگتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ رات کے وقت اُدھر سے گُزر سکے۔ خود ترمزی صاحب اُس سے اتنے خوف زدہ تھے کہ اشد ضرورت کے باوجود خود ہاسٹل کا دروازہ کھول کر رات کو باہر نہ نکلتے تھے۔ مُجھے یقین ہے کہ وہ بھی دِل ہی دِل میں خوش ہو رہے تھے کہ چلو اچھّا ہوا خس کم جہاں پاک۔ دروازہ پر بندھی بلا ٹلی۔ جب دیکھو جیپسی مشاعرہ کر رہا ہے۔ جہاں کسی ایرے غیرے کو اُس نے بے وقت اپنے دروازے کے سامنے سے گُزرتے دیکھا اس نے اپنی رزمیہ شاعری شروع کر دی۔ پھر وہ کسی قیمت پر بھی بس نہ کرتا تھا۔ مصرعے پر مصرعہ کہتا چلا جاتا تھا۔ اتنا بھونکتا اتنا بھونکتا کہ دوسرے بھونکنے والے بھی شرمندہ ہو جاتے تھے۔ کسی اور کی آواز وہ اُٹھنے ہی نہ دیتا تھا۔

۲

گراؤنڈ سمیت دو ڈھائی ایکٹر زمین پر وہ اسکول پھیلا ہوا تھا۔ وہاں سیکنڈ ماسٹر کا کبھی کوارٹر تھا۔ چپڑاسی شرف دین کا بھی کوارٹر تھا۔ ایک ہمارے ہاسٹل کا الگ بنا ہوا ٹفن روم تھا۔ سامنے فاصلے پر گراؤنڈ تھی جس کے دائیں ہاتھ اسکول کی پُر شکوہ عمارت تھی اور اِن سب عمارتوں کے اِرد گرد ایک چار دیواری تھی جس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چھوٹے چھوٹے سائے دار درخت اُگے ہوئے تھے اور اِس جاگیر پر جیپی کی حکومت کئی سالوں سے ایسی قائم تھی کہ کوئی اور کتّا اِدھر جھانک بھی نہ سکتا تھا۔ جب

تک جنسی تک سورج طلوع نہ ہو چکتا جب تک جیپسی شیر کی طرح چاروں طرف نگاہ رکھتا تھا۔ مجال نہ تھی کسی ایسے ویسے آدمی کی کہ وہاں پاؤں دھر سکے اور اسکول کا چپراسی شرف دین اور چوکیدار لال دین رات کو لمبی تان کر سوتے تھے۔ کیونکہ جیپسی جاگتا تھا اور بقول لال دین وہ بہت "کڑک" پہرہ دیتا تھا۔ اب وہی جیپسی قتل ہو چکا تھا جس کی وجہ سے تقی صاحب بہت غمگین تھے اور وہ ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ اس کا قاتل کر کون ہے؟

تقی صاحب ہم سے مایوس ہو کر واپس چلے گئے تو ہم اپنی کتابیں سنبھالنے کے لیے ہاسٹل کے کمروں میں جا پہنچے۔ میں نے ٹائم ٹیبل کے مطابق کتابیں بستے میں رکھیں اور دوڑ کر اسلم کی طرف لپکا۔ وہ اپنا بستہ اُٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا صحن عبُور کر رہا تھا۔ مجُھے اپنے قریب دیکھ کر اس نے

اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

میں نے کہا :

"کیا بات ہے یار ناراض ہو مُجھ سے ؟"

"نہیں!" اس نے بڑا مختصر جواب دیا۔

"پھر تُم چُپ چُپ کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تو اور کیا کروں۔ شور مچاؤں ؟" اس نے بڑی بے دلی سے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکل کر بائیں ہاتھ مُڑا۔

"اُدھر کہاں جا رہے ہو؟ اسکول تو اِدھر ہے۔" میں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

”مُجھے ایک ضروری کام ہے میں ابھی آتا ہوں۔“وہ بولا۔

”میں بھی ساتھ چلوں؟“میں نے کہا۔

”نہیں یار تنگ نہ کرو۔ جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“ اُس نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں شرمندہ سا ہو کر وہیں ٹھہر گیا۔

وہ اسکول کی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اسکول کھلنے میں ابھی بیس پچیس منٹ باقی تھے۔ میں نے سوچا دیکھوں تو یہ جا کہاں رہا ہے اِس وقت۔ اِسے تو سکول کی طرف جانا چاہیے تھا۔ بنگلے کی دیوار پھلانگ کر میں بھی اُس کے پیچھے چل دیا۔ اُس کی حرکتیں بڑی ہی عجیب و غریب نظر آتی تھیں۔ سامنے ایک گنّے کا کھیت تھا۔ اسلم کی نظر سے بچنے کے لیے

میں اُس کھیت میں جا گھُسا۔ وہ اِس کھیت کے کنارے کنارے چلتا ہوا جوہڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ کُچھ ایسا گہرا جوہڑ نہیں تھا۔ پھر بھی وہاں سارا سال پانی کھڑا رہتا تھا۔ برسات کے موسم میں تو وہ لبالب بھر جاتا تھا مگر اِس وقت سردی کا موسم اپنے عروج پر تھا اور کئی مہینوں سے بارش نہ ہوئی تھی اس لیے جوہڑ میں تھوڑا سا پانی تھا۔ بس گھٹنے گھٹنے گہرا۔

میں گنّے کے کھیت کے اندر چلتا ہوا جب دوسری طرف پہنچا تو اُس وقت اسلم اس جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ اُس نے بڑی خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر اپنے بستے میں سے رومال میں بندھی ہوئی کوئی چیز نکال کر اُس نے بڑے زور سے پانی میں پھینکی۔ ذرا دیر کے لیے پانی کی سطح پر بُلبُلے سے اُبھرے۔ رومال سمیت وہ چیز پانی میں ڈوب گئی اور سطح پھر سے پُرسکون ہو گئی۔ وہ پوٹلی پانی میں پھینک کر اسلم تیزی سے

واپس مُڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسکول کی طرف چل دیا۔

میرے ذہن میں طوفان مچا ہوا تھا۔ اسکول کھلنے میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا مگر میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس نے رومال میں باندھ کر کون سی چیز پانی میں پھینکی ہے۔ وہ کیا شے تھی جس سے وہ ہر طور چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں گنّے کے کھیت کے اندر ہی اندر چلتا ہوا دائیں طرف کو مُڑا اور کونے پر پہنچ کر اسلم کو اسکول کی طرف جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اتنا پریشان نظر آتا تھا کہ مُجھ سے بھی وہ کوئی بات نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ میرا اُس کا دِن رات کا ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ پتہ نہیں اُسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ جب نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا تو میں تیزی سے اُس جوہڑ کی طرف بڑھا۔ رومال جوہڑ کے عین درمیان میں گیا تھا۔ اپنی کتابیں میں نے کنارے پر رکھیں۔ پھر میں نے پتلون اُتاری۔

ایک انڈر ویر میں ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ سویٹر اور قمیص بھی میں نے اُتار کر الگ رکھ دیے۔ اب میں صرف ایک بنیان اور انڈر ویر میں ملبوس تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا چیز تھی جسے لے جا کر اسلم نے صُبح ہی صُبح اِس جوہڑ میں پھینک دیا ہے۔ جب میں نے پانی میں قدم رکھا تو میری قُلفی جمنے لگی۔ پانی بے حد سرد تھا۔ تھا۔ موسم اتنا سرد تھا کہ صُبح صُبح ویسے ہی آدمی کے دانت بجنے لگتے تھے۔ اور اب میں اپنے شک کو رفع کرنے کے لیے اس برف ایسے سرد پانی میں اُتر چکا تھا۔ اِس جوہڑ میں اتنے بڑے بڑے کچھوے تھے کہ پنجہ ماردیں تو ہڈّی تک گوشت کاٹ ڈالیں۔ اُن کا خوف الگ میرا خُون خُشک کر رہا تھا۔ پھر بھی میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھتا رہا۔ پانی کی تہہ میں مٹّی اتنی چکنی تھی کہ پاؤں آپ ہی آپ نیچے دھنستا چلا جاتا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمّت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ میں جوہڑ کے

عین وسط میں جا پہنچا۔ پانی اب میرے گھٹنوں سے بھی اُوپر آ چکا تھا۔

میں نے نیچے جھُک کر خود اپنے ہاتھوں سے اس رومال کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ دس منٹ کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد اچانک مُجھے وہ پوٹلی مل گئی۔ میں نے تیزی سے اسے پانی میں سے باہر نکالا۔

رومال میں کوئی بڑی سخت سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی گرہ کھولی تو میں ششدر رہ گیا۔ اس پوٹلی میں ایک کافی وزنی پستول تھا۔

ہوں تو یہ چیز تھی جسے اسلم صُبح ہی صُبح یہاں پھینکنے آیا تھا۔ اب تو کسی قسم کے شک و شُبے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جیپسی کو اِسی پستول کے ساتھ ہلاک کیا گیا تھا۔

میں نے سوچا۔ اب کیا کروں۔ پستول کو وہیں رکھ دوں یا واپس لے

چلوں۔ ہاں مُجھے یہ پستول وہاں سے نکال کر تقی صاحب کو دے دینا چاہیے۔ اب تو مُجھے چاہیے کہ میں ساری بات ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتا دوں۔

یہ سوچ کر میں تیزی سے واپس مُڑا اور کنارے پر آ کر میں نے پانی سے اپنی ٹانگوں کو کیچڑ سے پاک کیا اور کپڑے پہن کر میں اُلٹے قدموں واپس مُڑا۔ پوٹلی میرے ہاتھ میں تھی۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ کیوں نہ پہلے میں اسلم سے ساری بات پوچھوں۔ ابھی میں اِس پستول کو یہیں کہیں چھُپا دیتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مُجھے ہی کسی مُصیبت میں پھنسا دے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے گنّے کے کھیت کے کونے پر پہنچ کر ایک لکڑی سے گیلی مٹّی کھود کر اُس پوٹلی کو وہاں دفن کر دیا اور اس کے اُوپر اچھّی طرح گھاس پھونس ڈال کر میں نے سطح کو پوری طرح ہموار کر دیا۔

جب میں اسکول میں پہنچا تو دُعا کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال اُٹھتا تھا کہ اسلم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا ہے۔ جبسی سے اور لوگ بھی تو تنگ تھے پھر اسلم نے ہی کیوں اُس پر گولی چلائی ہے اور اُس نے صرف کتّے پر ہی گولی نہیں چلائی تھی بلکہ تقی صاحب کے کہنے کے مطابق اُس نے اُن کے نوکر اصغر پہ بھی وار کیا تھا۔ یہ ایسے سوال تھے جن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں بھی نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اسلم بھی۔ ہمارا فریق بھی ایک ہی تھا مگر ہم الگ الگ ڈیسکوں پر بیٹھتے تھے۔

دُعا کے بعد جب ہم کمروں کی طرف لپکے تو میں نے اسلم کو روک لیا اور دبی زبان سے کہا:

"میں تُم سے کُچھ پوچھنا چاہتا ہوں ادھر آؤ ذرا۔"

"کیوں خیر تو ہے کیا پوچھو گے تُم؟" وہ دوسرے لڑکوں سے الگ ہو کر میرے ساتھ چل دیا۔

ہم اپنے نویں بی کے کمرے کے سامنے سے گزر کر پانی کی ٹینکی کے سامنے جا کھڑے۔

"تُم رات کو ڈیڑھ بجے کہاں سے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

میرے اِس سوال پر وہ ایک دم گھبرا گیا اور بولا:

"کہیں سے بھی نہیں۔ میرے پیٹ میں درد تھا۔ ذرا دیر کے لیے میں پاخانے کی طرف گیا تھا۔"

"تُم نے کمبل لپیٹ رکھا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں! سردی کی وجہ سے میں نے کمبل لپیٹ لیا تھا۔" وہ بولا۔

"تُم نے اُس وقت کوئی گولی چلنے کی آواز سُنی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! میں اُس وقت غُسل خانے میں ہاتھ دھو رہا تھا۔" وہ بولا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تُم جوہڑ کی طرف کیوں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

میرے اِس سوال پر وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس کا رنگ بدلنے لگا۔

بولا:

"تُم یہ ساری باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں تمہارا دوست ہوں اسلم! تقی صاحب سمجھتے ہیں کہ جیپسی پر کسی لڑکے نے گولی چلائی ہے؟" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"میں اُدھر گنّے کے کھیت کی طرف گیا تھا۔ میں ہر روز اُدھر جایا کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تُم جھوٹ بول رہے ہو۔ جس کام کے لیے تُم اُدھر گئے تھے اُسے میں اچھّی طرح سمجھ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی بھی کام نہیں تھا مُجھے وہاں۔ کل میں اُدھر سیر کے لیے گیا تھا۔ وہیں کہیں میرا قلم گِر گیا تھا۔ میں اُسے وہاں پہ تلاش کرنے گیا تھا۔" "تُم نے وہ پستول کہاں سے لیا تھا جسے تُم ابھی ابھی جوہڑ میں پھینک آئے ہو؟"

اب کی بار میں نے ساری بات ہی صاف کر دی۔ میرے اس سوال پر اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا۔ مگر پھر مصنُوعی سا غُصّہ اپنے چہرے پر لاتے ہوئے بولا:

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ میں نے کوئی پستول وہاں نہیں پھینکا۔"

"تُم سمجھتے ہو میں تمہارا دُشمن ہوں اسلم! اگر جیپسی پر گولی تُم نے چلائی تھی تو مُجھے بتا دو۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ میں تمہارا دوست ہوں۔"

"نہیں! میں قسم کھا سکتا ہوں کہ جیپسی پر گولی میں نے نہیں چلائی۔" وہ اب کی بار بڑے دبے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کس نے مارا ہے جیپسی کو؟"

"مُجھے کیا معلوم۔ میں تو ہاسٹل میں موجود تھا۔" وہ بولا۔

"پھر تُم نے پستول وہاں کیوں پھینکا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر وہی بکواس۔ میں نے کوئی پستول وہاں نہیں پھنکا۔ میرے پاس کوئی

ایسی چیز تھی ہی نہیں۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تُم اتنی ساری باتیں مُجھ سے کیوں چھُپا رہے ہو۔ جبسی مارا گیا اچھّا ہوا۔ مگر تمہیں اپنے دوست سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔"

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا زُلفی! تُم کیوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" وہ زِچ ہو کر بولا۔

"اور اگر میں تمہیں وہ پستول دِکھا دوں تو؟" میں نے کیا۔

"دِکھانے سے کیا ہو گا۔ میرے پاس کوئی پستول تھا ہی نہیں۔" وہ پھر بولا۔

"اسلم! میں تنگ آ کر یہ ساری باتیں تقی صاحب کو بتا دوں گا۔ پھر تُم وہاں

جھوٹ نہ بول سکو گے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مُجھے دیکھنے لگا اور بولا:

"تمہارے جو جی میں آئے کرو۔ خواہ مخواہ کوئی مُجھ پر شک کرتا ہے تو کرتا پھرے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔ میں اُس کی یہ باتیں سُن کر سخت حیران ہوا۔ وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اُسی نے جبسی کو مارا تھا۔ اُسی نے وہ پستول جوہڑ میں میرے سامنے پھینکا تھا۔ پھر بھی وہ کہتا ہے کہ کوئی پستول اس کے پاس نہیں تھا۔ میں نے سوچا میں یہ ساری باتیں ابھی جا کہ تقی صاحب کو بتا دیتا ہوں پھر وہ جانیں اور اُن کا کام۔ دِل میں اِس بات کا تہیّہ کر کے میں اپنی کلاس میں جا پہنچا۔

ماسٹر صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ میں خاموشی جا کر اپنے ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ تقی صاحب عموماً نو بجے کے بعد اپنے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے سوچا میں نو بجے جا کر اُنہیں ساری بات بتا دوں گا۔ پھر دیکھوں گا میں کہ اسلم کسی طرح جھوٹ پر جھوٹ بولتا ہے۔ ابھی مُجھے وہاں بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اچانک اسلم میرے پاس آیا اور میرے کان پر مُنہ رکھ کر بولا:

"ابھی تقی صاحب سے کُچھ نہ کہنا۔ شاید میں آج یا کل ساری بات تمہیں بتا سکوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو وہ بولا:

”مطلب تو میں بھی نہیں سمجھتا۔ بس تُم کل تک انتظار کرو۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے ڈیسک کی طرف چلا گیا۔

میں نے سوچا اس سارے معاملے میں کوئی گہرا بھید نظر آتا ہے۔ اسلم کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے جیپسی کو مارنے کے بعد تقی صاحب سے بچنے کے لیے پستول کو جوہڑ میں پھینک دیا تھا۔ مگر دوسری گولی کس نے چلائی تھی اور اصغر کو مار دینے کی کوشش کیوں کی گئی تھی۔ اصغر پر اسلم ہرگز گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ یہ ساری بات ہی بڑی ٹیڑھی اور پیچیدہ دِکھائی دیتی تھی۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں نے پیچھے نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اسلم کلاس سے غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھی جمشید سے جا کر پوچھا کہ اسلم کہاں ہے؟

وہ بولا :

"وہ تو آدھ گھنٹہ ہوا کلاس سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ کہتا تھا میرے پیٹ میں درد ہے۔"

یہ بات سُن کر میں اور بھی حیران ہوا۔ اسلم کے پیٹ میں درد اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بڑا ہٹّا کٹّا سُرخ و سفید لڑکا تھا وہ۔ ورزشی جسم۔ ایسا پھرُتیلا کہ کھیل کے میدان میں سب لڑکوں کو پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔ سُرخ و سفید رنگ، چوڑا چکلا سینہ۔ عمر ابھی اُس کی مُشکل سے چودہ سال ہو گی مگر صحت ایسی تھی کہ پورا جوان نظر آتا تھا۔ اُس کے پیٹ میں درد کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

جب آدھی چھُٹی ہوئی تو میں بستہ اُٹھا کر تیزی سے ہاسٹل کی طرف لپکا مگر

معلوم ہوا کہ اسلم وہاں بھی موجود نہ تھا۔ میں تو اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ وہ تو بالکل چھلاوا بنتا جا رہا تھا۔ اُس کی حرکتیں میرے لیے بالکل ہی عجیب اور ناقابلِ فہم ہو چکی تھیں۔ کوئی پوچھے کہ تُجھے یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے میاں۔ تو جو عمرو عیّار بنتا جا رہا ہے۔ کبھی جھوٹ بولتا ہے کبھی کلاس سے غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی پستول چھپاتا ہے۔ یہ تو آدمی ہے یا کسی جادُوگر کا بھتیجا۔

مُجھے تو اُس پر سخت طیش آ رہا تھا۔ ہو گئی تُجھ سے ایک غَلطی۔ تُو نے کتّے کو ہلاک کر دیا اچھّا کیا۔ مگر کیا ضروری ہے کہ اب تو خواہ مخواہ ہی پُراسرار بننے کی کوشش کرتا پھرے۔ اِس طرح تو تُو آپ ہی آپ تقی صاحب کی نظروں میں آ جائے گا۔ پھر وہ تیری ایسی مرمّت کریں گے کہ یاد ہی رکھے گا۔ تیرا اسکول سے نام خارج کر دیں گے مگر نام خارج کرنے سے پہلے

وہ تیرے خان بابا کو بُلوائیں گے اور تیرے بابا جب آئیں گے تو پشتو میں سارے جہان کو بڑی بڑی وزنی گالیاں دیں گے۔ وہ جب غُصّے میں ہوتے ہیں تو خوب خوب پشتو بولتے ہیں وہ تو خوخو خاپ خاپ کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیں گے۔ نہیں مانیں گے کہ اُن کے صاحب زادے اسلم خان اچکزئی نے جیپسی کو ہلاک کرنے کے بعد اصغر پر بھی گولی چلادی تھی۔

مُجھے تو اپنے اس احمق دوست پہ سخت غصّہ آ رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔

شام کے کھانے پر جب میں ٹِفن روم میں پہنچا تو خالد نے مُجھے بتایا کہ ترمزی صاحب کے پاس اسلم کی تین دِن کی رُخصت کی درخواست آئی ہے جس میں لکھا ہے کہ اُس کے ابّا نبی پور میں سخت بیمار ہیں اور وہ اُن سے ملنے جارہا ہے۔

"کون درخواست لایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ترمزی صاحب کہتے تھے کہ کوئی لڑکا ان کو یہ درخواست دے گیا تھا۔"

"کون لڑکا تھا وہ؟"

"یہ تو مُجھے بھی معلوم نہیں۔ ترمزی صاحب نے اُس کی درخواست البتّہ منظور کرلی ہے۔" خالد بولا۔

یہ بات میرے لیے اور بھی زیادہ حیران کُن تھی۔ وہ تو اسکول سے پیٹ درد کا بہانہ کر کے اُٹھا تھا۔ پھر دوپہر کے بعد اُس کی تین دِن کی چھٹّی کی درخواست بھی آ گئی۔ اُسے یہ کس نے بتایا کہ اُس کے ابّا گاؤں میں بیمار ہیں۔ میں اُسی وقت اُٹھا اور تیزی سے ترمزی صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہ مُجھے راستے میں ہی مل گئے۔ ٹِفن روم کی طرف ہی آ

رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی ذوالفقار؟" وہ مُجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بولے۔

"جی وہ اسلم کی درخواست کون لایا تھا؟"

"ایک جوان سا آدمی تھا۔ کہتا تھا میں اسلم کا بڑا بھائی ہوں اور اُسے گاؤں لے جانے کے لیے آیا ہوں کیونکہ خان بابا سخت بیمار ہیں۔"

"کِس وقت آیا تھا وہ آدمی؟"

"پانچ بجے کے قریب آیا تھا وہ۔ بس درخواست دے کر چلا گیا۔ کہتا تھا اس کی چیزیں احتیاط سے رکھوا دیں۔ میں نے بستر تہہ کروا دیا ہے اور کتابیں بھی درازوں میں رکھوا دی ہیں۔ اللہ کرے اُس کے ابّا جلدی صحت یاب ہو جائیں۔"

وہ بہت مطمئن نظر آتے تھے۔ اُن کی یہ باتیں سُن کر میں بھی مطمئن ہو گیا۔

میں نے سوچا اُس کا بھائی آیا ہو گا جو اُسے اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا ہے۔ مُجھے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آپ ہی آ جائے گا مگر وہ راز کسی طرح بھی میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ اسلم نے پستول جوہڑ میں کیوں پھینکا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے سوچا جا کر دیکھوں کہیں کسی نے وہ پستول ہی وہاں سے نہ نکال لیا ہو۔ ابھی شام گہری نہ ہوئی تھی۔ میں ہاسٹل سے نکل کر جنگلے کی دیوار پھلانگ کر باہر چلا گیا۔ جہاں میں نے پستول دبا رکھا تھا وہ جگہ ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اس پر گھاس پھونس جوں کا تُوں رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک گنّا کھیت میں سے توڑا اور اُسے صاف کر کے کھاتا ہوا جوہڑ

کی طرف چل دیا۔

گنّے کے کھیت کے دوسرے کنارے پہ پہنچ کر میں رُکا تو اچانک میری نظر جوہڑ کے عین بیچ میں کھڑے ایک آدمی پر پڑی۔ وہ اپنی شلوار گھٹنوں سے اوپر تک اُٹھا کر پانی پر جھُکا ہوا تھا اور عین اُس جگہ جہاں اسلم نے پستول گرایا تھا پانی میں ہاتھ ڈال کر تہہ ٹٹول رہا تھا۔

اُسے دیکھ کر مجُھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ کون آدمی ہے جو شام کے جھٹپٹے میں وہاں سے میری طرح ہاتھ ڈال کر کچُھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ اسلم کی طرح اُس نے بھی کوئی چیز وہاں پھینک رکھی ہے۔ آخر یہ قصّہ کیا ہے۔ یہ آدمی کون ہے۔

میں اُس سے چھُپنے کے لیے کھیت میں گنّوں کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔

کافی دیر تک وہ شخص وہاں کھڑا اِدھر اُدھر کوئی چیز تلاش کرتا رہا۔ مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو اپنے ہاتھ دھو کر باہر نکل آیا۔ جوہڑ کے کنارے پر پُہنچ کر اُس نے اپنے پیر صاف کیے اور پھر جوتا پہن کر وہ گنّے کے کھیت کے کنارے کنارے چلتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ وہ چھ فٹ اونچا لمبا تڑنگا جوان تھا جس نے پشاوری ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اُس کی مونچھیں گھنی اور سیاہ تھیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوف ناک دِکھائی دیتی تھیں۔ پاؤں میں اُس نے پشاوری چپّل پہن رکھے تھے۔ گھیر دار شلوار اور لمبے آستین کا کُرتہ جس پر اُس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کا حلیہ دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ صورت شکل سے کوئی بہت ہی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے سامنے سے گُزر گیا۔ جب میرے اور اُس کے درمیان فاصلہ کافی بڑھ گیا تو میں بڑی خاموشی

کے ساتھ کھیت میں سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ شخص اسکول کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تحصیل کی عمارت کے قریب سے گُزر کر بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ وہاں کُچھ دیر تک، وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اور پھر وہ ہمارے اسکول کے بڑے گیٹ کی طرف چل دیا۔ گیٹ پر اُس نے دو گھڑی کے لیے رُک کر اندر جھانکا اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے اسکول کا خاکروب قمرُو سکول کے گیٹ سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھا اور اُس آدمی پاس پہنچ کر آہستہ ہو گیا۔ اب وہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ کوئی دس قدم تک وہ اکٹھّے چلتے رہے۔

میرا خیال ہے کہ وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ دس قدم اِکٹھّا چلنے کے بعد وہ چوک میں جا پُہنچے۔ وہاں سے قمرُو بھنڈی بازار کی طرف مُڑ گیا اور وہ آدمی ایک رکشے میں سوار ہو کر سیدھا چلا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس آدمی کا پیچھا کرتا رہوں اور دیکھوں کہ وہ کہاں رہتا ہے مگر جب وہ رکشے میں بیٹھ گیا تو میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

اب شام گہری ہو چکی تھی مگر ہاسٹل کی تمام بتّیاں بُجھی ہوئی تھیں۔ جب میں تقی صاحب کے کوارٹر کے سامنے پہنچا تو وہاں بھی مُجھے تاریکی ہی نظر آئی۔ اُن کے کوارٹر کی بتّی خراب ہونے کی وجہ سے وہاں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اصغر کو تقی صاحب دروازے میں کھڑے کہہ رہے تھے کہ وہ جا کر بجلی والے کو بلا لائے۔ مگر اصغر کہتا تھا کہ بجلی کا دفتر بہت دور ہے اور شام ہونے کی وجہ سے وہ اِس وقت بجلی درست کرنے کے لیے نہیں

آئیں گے۔

"بڑے سُست آدمی ہو تُم اصغر۔ اب ہم ساری رات اندھیرے میں بیٹھے رہیں۔ ہاسٹل میں لڑکوں کی پڑھائی کا حرج ہو گا۔"

"صاحب میں آپ کے کہنے کے مطابق چلا تو جاتا ہوں مگر وہ نہ آئے تو میرا ذمّہ نہ ہو گا۔"

"ہاں ہاں تُم جا کر تو دیکھو۔ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور آجائے گا۔ پتہ نہیں بجلی کو کیا ہو جاتا ہے؟" تقی صاحب بولے۔

میں یہ باتیں سُن کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا ہوا ہاسٹل میں جا گھُسا۔ وہاں بھی مکمّل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکوں نے اندھیرے سے بچنے کے لیے اپنی اپنی میزوں پر موم بتّیاں جلا رکھی تھیں۔

بتّی کا گُل ہو جانا کوئی نئی بات نہ تھی۔ اِس کا جب جی چاہتا تھا ہمیں اندھیرے میں گُم کر کے چلی جاتی تھی۔ میرے پاس دو موم بتّیاں رکھی تھیں۔ میں نے اُن میں سے ایک روشن کر کے میز پر رکھ لی اور لحاف کو اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

بہت سے لڑکے سونے کی تیّاریاں کر رہے تھے۔ اُس روز پڑھائی ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ موم بتّی کی کمزور سی روشنی میں پڑھنا آنکھیں پھوڑنے کے برابر بات تھی۔

کُچھ دیر تک تو میں اکڑوں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر میری رَت جگے کی ماتی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ اور میں لحاف اوڑھ کر جلدی ہی نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔ پھر خیال نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر کوئی خواب نہ آیا۔ نہ اسلم کا نہ اس شخص کا جسے میں نے جوہڑ پر دیکھا تھا، نہ قمرُو

خاکروب کا جسے میں نے چوک میں دیکھا تھا۔ سب کُچھ پیچھے رہ گیا اور میں نیند کی وادیوں میں ایسا کھو گیا کہ صُبح تک کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ صُبح ساڑھے چار بجے کے قریب اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ میرے ارد گرد شور ہی شور سُنائی دے رہا تھا۔ خالد اپنا کمبل لپیٹ کر باہر جا رہا تھا۔ راشد بھی باہر بھاگ رہا تھا۔ سب لڑکے بیدار ہو چُکے تھے۔ جس کے پاس ہاکی تھی وہ ہاکی، جس کے پاس لاٹھی تھی وہ لاٹھی اور جس کے پاس چاقو تھا وہ چاقو لے کر باہر بھاگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے خالد؟ کیا ہوا ہے؟ تُم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"رات تقی صاحب کے ہاں چوری ہو گئی ہے۔ چور اُن کے گھر سے سب کُچھ اُٹھا کر لے گئے ہیں۔" خالد نے جلدی سے کہا۔

یہ بات سُنتے ہی میں اُچھل کر بستر سے نکلا اور اپنی ہاکی اُٹھا کر تیزی سے باہر بھاگا۔ ہاسٹل کا بڑا دروازہ کھُلا پڑا تھا۔ اُس سے پرے سڑک پر بہت سے لڑکے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

تقی صاحب کے گھر سے رونے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ترمزی صاحب اُن کے دروازے پر کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تقی صاحب اور اُن کا داماد جو کویت سے آیا ہوا تھا باہر آئے۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ ترمزی صاحب کہہ رہے تھے۔

"کیا ہوا تقی صاحب یہ چوری کیسے ہو گئی؟"

"میری بیٹی کا گھر اُجڑ گیا ہے ترمزی صاحب۔ میرا یہ لڑکا چھ سال کویت میں گزار کر آیا ہے۔ اِن کے پاس بائیس ہزار روپے کے زیورات اور

آٹھ ہزار روپیہ نقد گھر میں موجود تھا۔ چور وہی کُچھ اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں تو تباہ ہو گیا ہوں ترمزی صاحب۔ کوئی پولیس کو ہی بلا لائے۔"

"میں ابھی تھانے میں اِطّلاع کرواتا ہوں تقی صاحب۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اصغر تو دوڑ کر تھانے دار کو بُلا لا۔ حمید صاحب سے کہنا تقی صاحب فوراً بلاتے ہیں۔ اُن کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔"

"بہت بہتر جناب میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ بات کہہ کر اصغر اسی وقت باہر کی طرف لپکا۔

"اوئے لڑکو جاؤ دو تین کُرسیاں اُٹھا لاؤ۔" ترمزی صاحب نے کہا۔

دو لڑکے تیزی سے ہاسٹل کی طرف بھاگے اور فوراً ہی چار کُرسیاں لا کر اُنھوں نے تقی صاحب کے دروازے کے سامنے رکھ دیں۔

”یہ تو کوئی سوچی سمجھی سازش معلوم ہوتی ہے تقی صاحب۔ پہلے کسی نے جلیبی کو ہلاک کیا پھر میدان صاف پاکر اندر گھُس گیا۔“

”میری پر عقل پر پردہ پڑ چکا تھا ترمزی صاحب۔ میں سمجھ نہ سکا کہ جلیبی کو کسی نے ایک منصوبہ بنا کر ہلاک کیا ہے۔ رات ہم دیر تک جاگتے رہے تھے۔ آج ایسی نیند آئی کہ کسی کو بھی ہوش نہ رہا۔ بچّے ایسے احمق ہیں کہ وہ شاید دروازہ بند کرنا ہی بھول گئے تھے کیونکہ بیٹھک کا دروازہ کھُلا ہوا ہے۔ چور اِسی پچھلے راستے سے اندر آئے۔ بیٹھک سے آگے ہماری خواب گاہ ہے۔ دائیں ہاتھ ہمارا اسٹور روم ہے۔ سارا قیمتی سامان وہیں رکھا تھا۔ چور بڑی آسانی سے اندر آئے اور اطمینان سے چیزیں تلاش کر کے لے گئے۔“

”بھید کے بغیر ایسا کام نہیں ہو سکتا تقی صاحب۔ آپ اسکول کے

سارے ملازموں کو اِکٹھا کریں۔"

"ارے زلفی جا ذرا قمرُو اور شرف دین کو بُلا لا۔" ترمزی صاحب نے کہا۔

"جی بہت اچھّا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ آ بھئی خالد۔" یہ کہہ کر میں خالد کو ساتھ لے کر پہلے شرف دین کے کوارٹر پر پہنچا۔ اُسے بڑی آوازیں دے کر جگایا اور جب اُسے بتایا کہ تقی صاحب کے ہاں چوری ہو چکی ہے تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔

ہم نے کہا:

"پہلے ہمیں قمرُو کو بلانا چاہیے۔"

وہ بولا:

"ہاں چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔

قمرُو کا کوارٹر اسکول کے دوسرے کونے میں تھا۔ وہ دو بھائی تھے جو اسکول کی صفائی ستھرائی کا کام کرتے تھے ایک بھائی پندرہ دِن پہلے قمرُو سے لڑ جھگڑ کر کراچی جا چُکا تھا اب اسکول کا سارا کام قمرُو اوراس کی بیری کرتے تھے۔ اِن دِنوں اس کی بیوی بھی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ گاؤں میں اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

اُس کے کوارٹر کا دروازہ کھُلا پڑا تھا۔ ہم صحن میں گھسے تو معلوم ہوا کہ اس کی کوٹھڑی کا بھی دروازہ کھُلا پڑا ہے۔ بجلی ابھی تک خراب تھی۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ شرف دین نے دیا سلائی جلائی اور کوٹھڑی میں جا

گھُسا۔

"اوئے قمرُو تو یہاں سویا پڑا ہے۔ اُدھر چوری ہو ہو گئی تقی صاحب کے ہاں۔ چل اُٹھ وہ تُجھے بلاتے ہیں۔"

شرف دین نے قمرُو کی چارپائی کو ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ لحاف اوڑھ کر لمبا لیٹا ہوا تھا۔ شرف دین کی بھاری بھر کم آواز سُن کر بھی نہ اُٹھا۔

اس نے آگے بڑھ کر ایک اور تیلی جلائی اور قمرُو کے مُنہ سے لحاف اُٹھا کر بولا:

"اوئے تو اُٹھتا کیوں نہیں ہے بھئی۔"

مگر قمرُو نے پھر بھی آنکھ نہ کھولی۔

"کیا بات ہے یار یہ تو بالکل ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

شریف دین نے گھبرا کر لحاف قمرُو پر سے ہٹا دیا۔

"ارے یہ تو مر چکا ہے۔ ہائیں یہ کیا قصّہ ہے۔" شرف دین نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

ہم نے آگے بڑھ کر ذرا غور سے دیکھا تو قمرُو کی پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ہم پر سخت وحشت طاری ہوئی۔ اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں تھا۔

شرف دین نے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر کہیں پر خُون کا ایک قطرہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ "اس نے زہر تو نہیں کھا لیا کہیں۔ چلو تقی صاحب کو بُلاتے ہیں۔ بڑا ظلم ہوا یارو۔ کتنا کڑیل جوان تھا قمرُو۔" شرف دین نے بڑے

غمگین لہجے میں کہا اور لحاف قمرُو کے مُنہ پر ڈال کر باہر نکل آیا۔

ہم دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے تقی صاحب کی طرف پلٹے۔

دور ہی سے کُرسیاں سامنے دیکھ کر شرف دین پُکارا:

"تقی صاحب قمرُو تو مرا پڑا ہے اپنی کوٹھڑی میں جناب۔ بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہے وہ بے چارا۔"

"کیا کہا قمرُو مر چُکا ہے؟ کس نے مارا ہے اُسے؟" تقی صاحب کا سانس اُوپر کا اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اُن کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ اتنی ساری دہشت ناک خبریں اُن سے برداشت ہی نہ ہو سکتی تھی۔

ترمزی صاحب کی آنکھیں بھی کھُلی کی کھُلی رہ اور وہ چوری کو بھول کر سب کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے قمرُو کے کوارٹر کی طرف بڑھے۔ تمام لڑکے اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔

صُبح کا اجالا چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ سب لڑکوں نے باری باری قمرُو کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے چارا واقعی مر چکا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کس نے مارا ہے۔ کیوں مارا ہے۔

تقی صاحب کا تو خوف کے مارے بُرا حال ہو چکا تھا۔ ان کا داماد جمیل احمد بھی سخت پریشان تھا۔ اُس کی ساری عمر کی کمائی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ صرف تیرہ ہزار روپیہ تھا جو اُس کے پاس میں محفوظ تھا۔ آٹھ ہزار روپیہ اس نے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے لیے بنک سے رکھوا رکھا تھا۔ اور وہ اس کا جہیز تیّار کرنے کے لیے تقی صاحب کے پاس آئے تھے تاکہ

بزرگوں کے مشورے سے سب کُچھ طے ہو۔ اور وہ بائیس ہزار روپے کا قیمتی زیور تقی صاحب کی بیٹی اپنے خاوند کی امارت ظاہر کرنے کے لیے جہاں جاتی تھی رشتہ داروں میں بین کرپھرتی تھی۔

تقی صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون دُشمن تھا جواُن کے پیچھے لگا تھا اور مُجھے اس روز کا منظر یاد تھا جب پہلے دِن تقی صاحب کی بیٹی وہاں پہنچی تھی۔ جیپسی نے پاگلوں کی طرح اُن پر حملہ کر کے اُن کی خوبصورت ساڑھی تار تار کر دی تھی اور تب اُن کا پرس جسے اُنھوں نے جیپسی کے دے مارا تھا آپ ہی آپ کھُل کر زمین پر ِگر گیا تھا اور اُس میں سے ڈھیر سارے نوٹ اور ڈھیر سارا زیور سڑک پر بِکھر گیا تھا اور تب اصغر اور تقی صاحب اور جمیل صاحب نے مل کر وہ سب کُچھ زمین پر سے اُٹھایا تھا اور وہاں کئی لڑکے کھڑے تھے اور اُن لڑکوں کے ساتھ ایک کونے میں قمرُو

خاکروب بھی کھڑا تھا اور وہ زیورات اور اُن روپوں کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

خالد نے مُجھے اس رات بتایا کہ قمرُو نے ان زیورات اوران نوٹوں کو دیکھ کر کہا تھا :

"بڑی امیر بی بی معلوم ہوتی ہیں یہ۔"

خالد قمرُو کے قریب ہی کھڑا تھا۔

بات تھی بس آئی گئی ہو گئی۔ مگر اُس روز وہ سارے نکتے آپ ہی آپ میرے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ خالد نے کان کے ساتھ مُنہ لگا کر کہا :

"مُجھے تو اس چوری میں قمرُو کا ہاتھ نظر آتا ہے، اور تب میرے ذہن میں اُس آدمی کا نقشہ اُبھرا جسے میں نے جوہڑ کے عین بیچ میں مٹّی ٹوٹتے دیکھا

تھا۔ تب مُجھے آدمی چوک میں چلتا ہوا قمرُو یاد آیا جس نے سس قدم اُس کے ساتھ چل کر خُدا جانے کیا کُچھ کہا تھا۔ یہ ساری باتیں آپ ہی آپ میرے ذہن میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ قلا بازیاں کھا رہی تھیں اور اس سارے ذہنی شور شرابے میں مُجھے اسلم دکھائی دیتا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ جیپسی پہ فائر کر رہا تھا۔

مگر کیوں؟

اسلم نے جیپسی پر کیوں گولی چلائی؟

یہ ایسا سوال تھا جس کا مُجھے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ اور یہ ساری باتیں اتنی انمل بے جوڑ معلوم ہوتی تھیں کہ ارادہ رکھنے کے باوجود میں اِن باتوں کو تقی صاحب کے سامنے نہ رکھ سکا۔ کیونکہ میں ڈرتا تھا کہ وہ مُجھے احمق سمجھ

کرڈانٹ دیں گے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آ پہنچی۔ اُنھوں نے بھی چوری اور قتل کی اِس وارادت کو ایک دوسرے سے پوری طرح ملا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر قمرُو کی کوٹھڑی میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی جس سے یہ ثابت ہو سکتا کہ چور وہاں تک بھی گئے ہوں گے۔ البتّہ تھانیدار صاحب نے قمرُو کے جسم کا خوب اچھّی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ قمرُو کا گلا گھونٹ کر اِسے مارا گیا۔ ہے۔ گردن کے سوا بدن پر اور کہیں کوئی نشان نظر نہیں آتا۔"

اور یہ ایسی بات بھی جس پر ہم سب اتّفاق کرنے کو تیّار تھے۔ مرا تو وہ کسی نہ کسی وجہ سے ضرور تھا۔ آپ ہی آپ تو موت اُس پر وارد نہ ہوئی تھی۔

مگر جس بات کا سوال چیمہ صاحب کو معلوم کرنا چاہیے تھا وہ سوال یہ تھا کہ اِس بے چارے کو کِس نے مارا تھا۔ کیوں مارا تھا اور کس وقت مارا تھا؟ تقی صاحب کے ہاں چوری کسی نے کی تھی؟ کس وقت کی تھی؟ قمرُو چوری سے پہلے مارا گیا یا بعد میں؟

یہ تھے وہ سوالات جن کا جواب حمید صاحب کو تلاش کرنا چاہیے تھے۔

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی اور ابھی تفتیش اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اُس روز ہم میں سے کسی کو بھی اسکول جانے کا ہوش نہ تھا۔ سارا ہاسٹل وہاں تقی صاحب کے دروازے کے سامنے جمع تھا۔ نہ عبدل باورچی کو ناشتے کا خیال آیا نہ ہمیں مُنہ ہاتھ دھولینے کی بات یاد آئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم جو تعداد میں ایک سو دس تھے ہم سب تقی صاحب کے ایک سو دس نالائق ترین بیٹے تھے جِن کی آنکھوں کے

سامنے ہماری بہن لُٹ کے رہ گئی اور ہم کُچھ بھی نہ کر سکے۔ یہ ایسا دُکھ تھا جسے ہم قطعی طور پر اپنا ہی دُکھ سمجھ رہے تھے۔ سب لڑکوں کے دِل غمگین تھے۔ ہمارا بس نہ چلتا تھا ورنہ ہم چوروں کو پکڑ کر اُن کی تِکّا بوٹی اُڑا دیتے۔ لیکن ہم کُچھ بھی نہ کر سکے۔

تھانیدار نے لاش اُٹھوا کر طبّی معائنے کے لیے بھجوا دی اور چوری کی ساری تفصیلات کاغذات پر لکھ کر وہ واپس چلا گیا۔

اچانک ترمزی صاحب کو ہم یاد آئے تو اُنھوں نے ہم سب کو بڑی سختی سے ڈانٹ کر وہاں سے پرے ہٹا دیا۔ لڑکے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے بڑی بے دِلی سے مُنہ ہاتھ دھویا۔ دماغ میں عجیب سا طوفان مچا ہوا تھا۔ رہ رہ کر مجُھے اسلم کی وہ ساری پُراسرار حرکتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں نے ناشتہ بھی نہ کیا بس اُسی طرح نہار مُنہ کتابیں اُٹھا کر

اسکول چلا گیا۔ اسلم وہاں ہوتا تو میں اُس سے پوچھتا کہ یہ اندھیر کِس نے
بچایا ہے۔ مُجھے تو سارا قصّہ اُسی کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب مُنہ چھُپا کر گھر جا
بیٹھا تھا۔ ایک جی چاہتا تھا میں جا کر تقی صاحب کو اسلم کی ساری باتیں بتا
دوں۔ مگر پھر میں سوچتا کہ وہ بے چارا بس خواہ مخواہ ہی نہ کسی مخمصے میں
پھنس جائے۔ اُس نے پوری بات بھی مُجھے نہیں بتائی تھی۔ خُدا جانے وہ
قصوروار تھا بھی کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے پستول اُس کے پاس اپنے ابّا کا ہو
جِسے شک سے بچنے کے لیے اُس نے پریشان ہو کر جوہڑ میں پھینک دیا
تھا۔ مگر پھر یہ سوال میرے ذہن میں اُبھرتا کہ اِس آدمی کو جو پشاوری ٹوپی
پہنے ہوئے تھا جوہڑ کے عین بیچ میں پانی کے اندر ہاتھ ڈال کر مٹّی ٹٹولنے کی
کیا ضرورت تھی۔ وہ یقیناً وہاں سے پستول ہی تلاش کر رہا تھا مگر اُسے
کسی نے بتایا کہ اسلم نے کوئی پستول وہاں پھینکا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آدمی

اِس وقت وہیں کہیں قریب ہی کھڑا دیکھ رہا ہو۔ مگر یہ بات قرین قیاس معلوم نہ ہوتی تھی کیونکہ اپنی بھی تو دو آنکھیں ہیں اور اسلم بھی اندھا نہیں تھا۔ اُس نے چاروں طرف خوب اچھّی طرح دیکھ بھال کر پستول پھینکا تھا۔ پھر میں نے اُس کے جانے کے فوراً ہی بعد اُسے وہاں سے نکال بھی لیا تھا۔ اگر کوئی آدمی دیکھ رہا ہوتا تو وہ پھر دوبارہ اُسی جگہ اس پوٹلی کو تلاش نہ کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی دوسرے شخص نے اُسے بتائی تھی کہ اسلم نے پستول کہاں پھینکا تھا مگر اِن لوگوں کا اسلم کے پستول سے تعلّق کیا تھا۔

یہ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے میرا دماغ بُری طرح اُلجھ رہا تھا اور جب تک میں کلاس میں بیٹھا رہا ہی سوچتا رہا کہ یہ سب کُچھ کیونکر مُمکن ہوا۔

"آدھی چھٹّی ہوئی تو اچانک مجھے خیال آیا کہ میں فوراً اسلم سے ملوں۔ کیونکہ

ایک صرف وہی تھا جو اِس معاملے پر تھوڑی بہت روشنی ڈال سکتا تھا۔

میرے پاس اُس وقت اٹھارہ روپے موجود تھے۔ میں نے سوچا کل اتوار ہے۔ اسکول میں چھٹّی ہوگی۔ میں ابھی بس میں سوار ہو کر اسلم کے گاؤں نبی پور پہنچ سکتا ہوں۔ اُسے میں وہاں سے ساتھ ہی لے آؤں گا اور پھر پوچھوں گا کہ قصّہ کیا ہے۔

کسی نے قمرُو کو مارا؟

اور کس نے جبپسی کو ہلاک کیا؟

کسی نے تقی صاحب کو لُوٹا ہے؟

اور کسی نے تجھے پستول دیا تھا؟

یہ ساری باتیں سوچا کہ میں اپنے ماسٹر حبیب احمد صاحب کے پاس پہنچا۔

اور میں نے کہا :

"ماسٹر صاحب! میں آدھے دِن کی چھُٹّی چاہتا ہوں۔ اسلم کے گاؤں جا کر اُس کے ابّا کی مزاج پُرسی کروں گا۔ وہ سخت بیمار ہیں۔"

وہ بولے :

"چلے جاؤ بیٹا! مگر واپس کب آؤ گے؟"

"جی بس کل شام تک واپس آ جاؤں گا۔ کل اتوار ہی تو ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ اپنے سپر نٹنڈنٹ ترمزی صاحب سے بھی کہتے جاؤ۔ اُن

کی اجازت کے بغیر باہر نہ جانا۔" وہ بولے۔

"جی بہت بہتر۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے سیدھا ترمزی صاحب کی طرف بھاگا۔

اُنھوں نے کوئی عُذر نہ کیا۔

بس اِتنا کہا:

"بیٹا راستے میں کسی اجنبی سے کوئی بات نہ کرنا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ کل شام تک واپس آجاؤ گے نا؟"

"جی ہاں ماسٹر صاحب۔ میں کل شام سے پہلے آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اپنی چیزیں اچھّی طرح سنبھال کر جانا۔ کھُلی چیزیں اِدھر

اُدھر ضائع ہو جاتی ہیں۔" وہ ہوئے۔

اُن کی یہ بات سُن کر میں اُسی وقت ہاسٹل میں پہنچا اور اپنے ٹرنک میں سارا سامان بند کر کے میں نے تالا لگا دیا اور بستر تہہ کر کے رکھنے کے بعد میں اُسی وقت بسّوں کے اڈّے کی طرف چل دیا۔

مُجھے شام سے پہلے پہلے نبی پور پہنچ جانا چاہیے تھا جو وہاں سے چالیس میل دور تھا۔

اڈّے پر پہنچتے ہی مُجھے بس مل گئی اور میں اُس میں سوار ہو کر نبی پور کی طرف چل دیا۔

سارا راستہ سخت بے چینی میں کٹا۔ بار بار وہی سوالات میرے ذہن میں اُبھرتے تھے جن کا کوئی جواب مُجھے معلوم نہ تھا۔

ابھی پہر دِن باقی تھا کہ سڑک پر ایک جگہ بس روک کر کنڈکٹر نے مُجھے نیچے اُتار دیا۔

اور بولا :

”نبی پور کو یہ راستہ جاتا ہے۔ بس تین میل پیدل چلنا ہو گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے دوست ملنے کے لیے میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا نبی پور کی طرف چل دیا۔

۳

وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس کے بیشتر مکان کچّے اور مٹّی گارے کے بنے ہوئے ہیں۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کسان رہتے ہیں جو زمین کا سینہ بڑی محنت سے چیرتے ہیں اور اس میں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی کئی کی ہتھّی اور بیل کی دُم تک محدود ہے۔ وہ سیدھی سادھی زندگی گزارتے ہیں جس میں نہ خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی ریشم کی۔ نہ اچھّی کار کی خواہش ہوتی ہے نہ تیز روی کی۔ بس وہ قدرت کی آغوش میں قدرت کا ایک حصّہ بن کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ وہ اناج اُگاتے ہیں اور خُدا

کا شُکر ادا کرتے ہیں۔ تمہاری زندگی کی ساری رونقیں دراصل اُس کسان کی محنت پر مُنحصر ہیں۔ اگر وہ دُور اُفتادہ گاؤں میں ہل کی ہتھّی اور بیل کی دُم پر سے ہاتھ اُٹھالے تو شہر اُجڑ جائیں۔ کھانے کو ایک دانہ بھی نہ ملے۔

جب میں نبی پور پہنچا تو ایک لڑکے نے میری رہنمائی کی اور وہ کئی ایک کچّی گلیوں میں سے گزار کر مُجھے ایک صاف سُتھرے پُختہ مکان تک لے گیا۔

اور بولا:

"یہی ہے خان صاحب کا گھر؟"

میں نے دروازے پر دستک دی تو اسلم کے ابّا جان فوراً باہر آ گئے اور مُجھے وہاں کھڑا دیکھ کر بے حد حیران ہوتے ہوئے بولے:

"تُم۔ ارے ذوالفقار تُم یہاں کیسے آئے ہو؟"

"جی میں تو آپ کی بیماری کا حال سُن کر مزاج پُرسی کے لیے آیا ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔

کیونکہ وہ تو بالکل ہی تندرست نظر آتے تھے۔

بولے :

"میری مزاج پُرسی؟ میں خُدا نخواستہ کوئی بیمار تو نہیں ہوں۔ اللہ کا فضل ہے مُجھ پر۔ تُم اکیلے ہی آئے ہو اسلم نہیں آیا؟" وہ حیرت زدہ ہو کر ہوئے۔

"جی نہیں۔ اسلم تو کل دوپہر کا آگیا ہوا ہے۔ اسکول میں اُس کی تین دِن کی درخواست آئی ہوئی ہے کہ میرے ابّا بیمار ہیں اور میں اُنہیں دیکھنے جا رہا ہوں۔ وہ تو کل ہی آگیا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی اُسے لینے آئے تھے۔"

میری یہ بات سُن کر خان صاحب ایک دم دروازے سے باہر آ گئے۔

اور بولے :

"تُو! تو کیا کہہ رہا ہے لڑکے! اسلم تو یہاں نہیں آیا اور اُس کا بڑا بھائی کہاں سے پیدا ہو گیا۔ کہاں ہے وہ؟"

وہ ایک دم بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔

"جی میں سچ عرض کر رہا ہوں۔ میں تو دراصل اسلم کو ہی لینے آیا ہوں۔ اُدھر ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر میں رات چوری ہو گئی ہے اور اسکول کے جمعدار کو کسی نے گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔"

"مگر اِس بات سے اسلم کا کیا تعلّق ہے۔ میری سمجھ میں تو کُچھ نہیں آیا۔ اچھّا تو ٹھہر! میرے گھر میں کسی کو کُچھ نہ بتانا۔ اسلم کی ماں خواہ مخواہ رو رو کر

ہلکان ہوگی۔ تو کھانا کھالے پھر میں تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

"جی مُجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ فوراً میرے ساتھ چلیں۔ مُجھے ڈر ہے کہیں اسلم کو اُس کے دُشمن کُچھ کر نہ دیں۔" میں نے کہا۔

"کون دُشمن ہیں اُس کے۔ کسی نے لڑائی کی ہے اُس سے؟" وہ بے چین ہو کر ہوئے۔

"جی مُجھے تو کُچھ معلوم نہیں ہے۔ پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب کا کُتّا جیپی کسی نے ہلاک کر دیا تھا تو اسلم کہنا تھا کہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کس کی شرارت ہے۔ میں نے سوچا شاید اُسے کُچھ معلوم ہو۔ اِسی لیے میں یہاں آیا تھا۔

"یہ سب تمہارے دماغ کی خرابی معلوم ہوتی ہے۔ اسلم کو کیا پتہ کہ کس نے کُتّے کو مارا ہے۔ تو اُسے خواہ مخواہ اِس مسئلے میں پھنسا رہا ہے۔ کسی

اور کو تو یہ باتیں نہیں بنائی ہیں تو نے۔"

"جی نہیں! میں نے اور کسی سے ذکر نہیں کیا کہ اسلم بھی کُچھ جانتا ہے۔"

"ہاں اپنی زبان کو بند ہی رکھنا۔ اللہ میرے بچّے کو محفوظ رکھے۔ پتہ نہیں اُس نے چھٹّی کیوں لی۔ اور وہ کہاں بیٹھا ہے اِس وقت۔ تو ٹھہر۔ میں کپڑے بدل کر ابھی واپس آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مُجھے گلی میں ہی ٹھہرا کر اندر چلے گئے اور دس منٹ بعد وہ کالی شیروانی اور سفید شلوار پہن کر سر پر طرّے دار پگڑی رکھ کر باہر آ گئے۔ اپنے ملازم سے کہہ کر اُنھوں نے دو گھوڑیاں منگوائیں۔ وہ اُن کی اپنی گھوڑیاں تھیں۔ ایک پر ملازم سوار ہوا اور دوسری پر وہ خود اپنے پیچھے اُنھوں نے مُجھے بٹھایا اور گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے سڑک کی

طرف چل دیے جہاں سے بس میں بیٹھ کر شہر پہنچ سکتے تھے۔

سڑک پر پُہنچ کر اُنھوں نے گھوڑیاں ملازم کے حوالے کیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد بس آ گئی جسے روک کر اُس میں سوار ہو گئے۔ ایک ہی گھنٹے میں ہم شہر جا پہنچے۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو چکا تھا۔ خُدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ یہ ایسی انہونی بات تھی جس پر مُجھے یقین ہی نہ آتا تھا۔ اُس کے ابّا تو بے حد پریشان تھے۔ اُن کے مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ مُجھ سے وہ طرح طرح کے سوال پوچھتے رہے۔ میں نے اُنھیں سب کُچھ بتایا مگر پستول کی بات میں نے جان بُوجھ کر اُن سے چھُپا لی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میری یہ بات سُن کر وہ ایک دم آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ وہ اپنے بیٹے کے خلاف

ایسی باتیں برداشت ہی نہ کرسکتے تھے۔ وہ لفظ جس سے یہ ثابت ہوسکتا کہ اسلم قصوروار ہے اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور میں بھی گومگو کی حالت میں گرفتار تھا۔ کیونکہ قطعی ثبوت تو اسلم کے قصور کا میرے پاس بھی نہ تھا۔ سب اندازے ہی اندازے تھے۔ قیافے ہی قیافے۔ لیکن اُس کا اِس طرح اچانک اسکول سے تین دِن کی چھٹّی باپ کی بیماری کے بہانے سے لے کر غائب ہوجانے کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ درخواست اُس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ پھر اس کا بڑا بھائی کہاں سے پیدا ہوگیا تھا۔ یہی سوال خان صاحب پوچھتے تھے۔ یہی سوال بار بار میرے ذہن میں بھی اُٹھتا تھا۔ مگر کوئی بھی تو جواب ہمیں نہیں ملتا تھا۔ اب اُس کے یُوں غائب ہوجانے سے میں تو پریشان تھا ہی، اُس کے ابّا کے تو ہاتھوں طوطے اُڑے ہوئے تھے۔

بسوں کے اڈّے پر اُترتے ہی خان صاحب نے رکشا لیا اور اُس میں سوار ہو کہ ہم پلک جھپکتے میں ہاسٹل جا پہنچے۔

ترمزی صاحب اور تقی صاحب اِس وقت باہر دروازے کے سامنے کرسیاں رکھوا کر بیٹھے تھے۔ اُن کا داماد بھی وہیں تھا۔ خان صاحب نے جاتے ہی پوچھا: "ترمزی صاحب میرا لڑکا کہاں ہے؟"

"جی کیا مطلب؟ اسلم آپ کے پاس تو گیا تھا۔ کہتا تھا آپ کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں تو اچھّا بھلا اور تندرست ہوں۔ بچّے کو میں نے آپ کے حوالے کیا تھا۔ مُجھے بتائیں وہ کہاں گیا ہے۔ وہ میرے پاس بھی نہیں پہنچا۔ ذوالفقار نے جا کر مُجھے بتایا کہ وہ تین دِن کی چھٹی پر ہے۔ وہ عرضی

دِکھائیں کہاں ہے اور یہ بتائیں کہ وہ کون اُلّو کا پٹھّا تھا جو وہ عرضی لے کر آیا تھا۔ میں تو بھون رکھ دوں گا اُس کو۔" خان صاحب نے پہلو میں لٹکتے ہوئے پستول کو تھپ تھپا کر کہا۔

"وہ ساڑھے چھ فٹ اُونچے برچھ ایسے وجیہہ قد کے مالک تھے۔ اُن کو دیکھ کر بڑے بڑے آدمیوں کا زہرہ آپ ہوتا ہو گا۔"

ترمزی صاحب گھبرا کر اُٹھے اور ہاسٹل کی طرف بھاگے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں ایک عرضی تھی۔

"دیکھیں خان صاحب۔ یہ ہے وہ درخواست مُجھے نہیں معلوم کہ وہ کون آدمی تھا جو یہ لے کر آیا تھا۔ وہ خود کو اسلم کا بڑا بھائی بتاتا تھا۔" ترمزی صاحب نے کہا۔

”کمال ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات بالکل ہی نہیں آتی۔ کیا حُلیہ تھا اُس آدمی کا؟“ خان صاحب بولے۔ لمبے اکھرے قد کا جوان آدمی تھا وہ۔ ڈاڑھی مونچھ بالکل صفا چٹ۔ نیلے رنگ کا کوٹ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سفید اُونی مفلر تھا اُس کے۔ اِس سے زیادہ تو مُجھے کُچھ معلوم نہیں۔“ ترمزی صاحب نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے لڑکے کے ساتھ سخت دھوکا ہوا ہے۔ اب یہ بھی تو پتہ نہیں کہ وہ شہر میں کس کس سے ملتا تھا۔“ خان صاحب بولے۔

”لڑکوں کو شہر میں جانے ہی نہیں دیتے۔ اُن کا ٹائم ٹیبل ہی ایسا رکھا ہے کہ وہ سارا دِن مصروف رہتے ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے۔ اب تو مُجھے بھی تشویش ہو رہی ہے۔“

"زلفی تُم ہی بتاؤ کُچھ۔ وہ کِن لوگوں سے ملتا تھا۔ کون کون اُس کے دوست تھے؟" خان صاحب نے سخت فکرمند لہجے میں کہا۔

بیٹے کے غم میں اُن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کیونکہ ایسا معاملہ تھا کہ اُنہیں کسی طرف سے بھی اُمّید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔

"چچا جان میں خود حیران ہوں کہ وہ تین دِن کی چھٹّی لے کر کہاں چلا گیا ہے۔ اُس کے دوست تو بس یہی اسکول کے لڑکے ہیں۔ اِن میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ذرا میرے ساتھ تھانے چلیں ترمزی صاحب! میں وہاں رپٹ تو درج کروا دوں۔ اللہ خیر کرے۔ میرا بچّہ تو بہت ہی بھولا بھالا ہے۔ تقی صاحب کی چوری کا سُن کر الگ صدمہ ہوا ہے۔ اُن کی پریشانی بھی نہیں

دیکھی جاتی۔ وہ قمرُو کسی طرح مرا ہے؟" خان صاحب نے کہا۔

"اُسے کسی نے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ پولیس ابھی تک کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ سکی۔ سارا معاملہ بڑا ہی ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔" ترمزی صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ دونوں اُٹھ کر تھانے کی طرف چل دیے۔ مُجھے خان صاحب نے ساتھ لے جانا ضروری نہ سمجھا۔ کُچھ تک میں تقی صاحب کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اُنھوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اگلے دو دِن سخت پریشانی میں گزرے۔ اسکول کے لڑکوں کو ساتھ لے کر ترمزی صاحب اور خان صاحب نے سارا شہر چھان مارا۔ آس پاس کے کھیت بھی دیکھے ڈالے مگر اسلم کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔ پولیس اِس نتیجے پر

پہنچی تھی کہ قمرُو کو چوروں نے قتل کیا ہے۔ اور وہی اسلم کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ کیونکہ مُمکن ہے اسلم کو اُن کے متعلّق کافی معلومات حاصل ہو چکی ہوں۔

مگر یہ ایسا قیافہ تھا جس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ترمزی صاحب نے بھی یہی سوچا تھا اور خان صاحب بھی اِسی نتیجے پر پُہنچے تھے۔

میری تو راتوں کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ یُوں لگتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر پھوڑا نکل آیا ہے۔ میرے سینے میں اسلم کا جو راز کلبلا رہا تھا وہ ایسا تھا جسے ظاہر کرنے سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ الٹا سب لوگ یہی کہتے کہ سارا کیا دھرا اسلم کا ہے۔ وہ چوروں ساتھ ملا ہوا تھا۔ میں گنّے کے کھیت میں کئی بار جا کر دیکھی آیا تھا پستول ابھی تک وہاں محفوظ پڑا تھا۔ میں

صُبح شام وہاں جا کر اطمینان کر لیتا تھا۔

تیسرے دِن حسبِ معمول میں شام کے وقت جان بوجھ کہ اُس جوہڑ کی طرف جا نکلا اور گنےّ کی فصل میں چھُپ کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ شخص پھر وہاں پستول تلاش کرنے کے لیے آئے۔ کافی دیر میں وہاں کھڑا رہا مگر کوئی بھی شخص وہاں نہ آیا۔

شام گہری ہوئی تو چاندنی ایسی چٹکی کہ سوئی پھینکو تو گُم نہ ہو۔ میں ابھی تک اِس انتظار میں وہاں کھڑا تھا کہ شاید کوئی شخص وہاں آ جائے اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دو آدمی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جوہڑ کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور اُن کے درمیان میں ایک نَو عُمر لڑکا چل رہا تھا۔ وہ مُجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ میں کھیت کے اندر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب جا پہنچا۔ اب اُن کی باتیں

صاف سُن سکتا تھا۔ وہ لڑکا جو اُن کے درمیان کھڑا تھا اسلم تھا اور اُنہیں بتا رہا تھا کہ اس نے وہ پستول جوہڑ میں کسی جگہ پھینکا تھا۔

"تُو جھوٹ بولتا ہے اُلّو کے چرخے۔ میں تین دفعہ دیکھ چُکا ہوں۔ میرا آٹھ سو روپے کا پستول ہے وہ۔ وہ مُجھے بہ ہر قیمت واپس ملنا چاہیے۔"

"میں سچ کہتا ہوں ٹِکّا صاحب۔ میں نے اُسے یہیں پھینکا تھا۔" اسلم نے بڑی مریل سی آواز سے کہا۔

"پھر کہاں گیا وہ؟ بولو کس کو معلوم تھا کہ تُم وہ پستول پھینک رہے ہو۔ بتاؤ ورنہ ہم تمہیں جان سے مار دیں گے۔"

"جب میں وہ پستول پھینک رہا تھا تو اُس وقت اِس گنّے کے کھیت میں میرا دوست ذوالفقار مُجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے اُس نے وہ پستول

نکال لیا ہو گا۔" اسلم نے جواب دیا۔

"یہ بات تُم نے پہلے کیوں نہ بتائی۔" ٹِکّا بولا۔

"میرا خیال تھا کہ اُس نے نہیں نکالا ہو گا کیونکہ پستول پھینکنے کی بات تو اُس نے بتائی تھی مگر اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ پستول اُس نے نکال لیا تھا۔"

"کہاں رہتا ہے وہ تمہارا دوست؟" دوسرے آدمی نے پوچھا۔

"اِسی اسکول میں پڑھتا ہے وہ۔" اسلم نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"راجو! اِس لڑکے کو پکڑ کر کل میرے سامنے پیش کرو۔" ٹِکّا نے کہا۔

"کوئی ترکیب لڑانا پڑے گی اُستاد۔" راجو بولا۔

"وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ چل اوئے مُرغے کے بچّے۔ تیرا ستیاناس۔ تُو نے ہمارا کباڑا کرنے کی سوچ رکھی ہے۔ چل آگے لگ۔" یہ کہہ کر اُس نے اسلم کی گدّی میں ایک دھول جمائی اور وہ بے چارا لڑکھڑاتا ہوا اُن کے آگے آگے چل دیا۔

میرے اور اُن کے درمیان جب ذرا سا فاصلہ ہوا تو میں گنّے کے کھیت سے نکل کر اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے بڑی سڑک پر جا چڑھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ پیدل چلیں گے مگر نہیں وہاں اُنہوں نے ٹیکسی کھڑی کر رکھی تھی۔ وہ تینوں اُس میں سوار ہو کر چل دیے۔

پیچھے ایک رکشا آ رہا تھا۔ میں نے اُسے ٹھہرایا اور اس میں سوار ہو کر میں

نے رکشا ڈرائیور سے کہا :

"اِس ٹیکسی کا پیچھا کرو۔ مُجھے ان لوگوں سے ملنا ہے۔"

رکشہ ڈرائیور میری بات سمجھ کر پوری رفتار سے اُس ٹیکسی کے پیچھے چلنے لگا۔ میرے پاس اُس وقت دس روپے موجود تھے۔ میں بے فکر تھا۔ ٹیکسی بہت تیز چل رہی تھی۔ رکشا کسی طرح بھی اُس کا مُقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ تک یہ ریس جاری رہی۔ اچانک رکشا کے پچھلے پہیّے میں پنکچر ہو گیا۔

اڑا اڑا دھم۔ میری اُمّیدوں کے سارے محل زمین بوس ہو گئے۔

"مُجھے افسوس ہے بھی کہ میں آپ کے کام نہ آ سکا۔" ڈرائیور بولا۔

"اس ٹیکسی کا نمبر معلوم ہے آپ کو؟"

"نہیں اُس کے قریب ہونے کا مُجھے موقع ہی نہیں مل سکا۔" وہ بڑے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"بہت بُرا ہوا جناب! وہ میرے دوست کو اغوا کر کے لیے پھرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"آپ اِن کو جانتے ہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"نہیں۔ میں نے اُن میں سے صرف ایک آدمی کی شکل دیکھی ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر آپ پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتے؟"

”وہ بھی کوشش کر رہے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی پوری کوشش کرنی چاہیے۔“

”اچھّا بھئی خُدا کرے آپ کا دوست مل جائے۔ اب آپ بس میں بیٹھ کر واپس چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو آپ خو کسی مُصیبت میں پھنس جائیں۔ میں تو اب ٹائر بدل کر جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

میں نے اُسے کرایہ ادا کیا اور وہاں سے بس میں بیٹھے واپس آ گیا۔

معلوم ہوا کہ ہم شہر کے دوسرے سِرے تک جا پہنچے تھے۔ خُدا معلوم اِن لوگوں کا ٹھکانہ کہاں تھا۔ وہ کس جگہ رہتے تھے اور کیا کیا کُچھ کرتے تھے۔

میں جب ہاسٹل پہنچا تو ترمزی صاحب مُجھے دیکھتے ہی مُجھ پر برس پڑے۔

بولے :

"تو کہاں سے آیا ہے آوارہ گردی کر کے۔ تُجھے معلوم ہے کہ ایک لڑکا پہلے ہی ہماری ذمّہ داری میں یہاں سے چکا ہے۔ اب تو بھی کسی مُصیبت میں پھنسنا چاہتا ہے۔"

خان صاحب اُن کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ وہ جب سے شہر آئے تھے جب سے انھی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی کہنے لگے :

"بیٹا! تمھیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایسے وقت میں تو لڑکوں کو باہر جانا ہی نہیں چاہیے۔"

"جی میں اُن لوگوں کا پیچھا کر رہا تھا جو اسلم کو اغوا کر چُکے ہیں۔ میں نے اسلم کو بھی دیکھا ہے۔"

"کیا؟ کیا کہا؟ تُو نے اسلم کو دیکھا ہے۔ کہاں؟" خان صاحب ایک دم اُچھل کر بولے۔

ترمزی صاحب بھی اُٹھ کر میرے پاس آ گئے۔

تب میں نے وہ ساری باتیں جو مُجھے معلوم تھیں اُنہیں بتا دیں کیونکہ اب میں اِن باتوں کو اپنے سینے میں چھُپا نہیں سکتا تھا۔ مُجھے رہ رہ کر اسلم کا خیال آتا تھا اس کے ساتھ بہت ہی بُرا سلوک کر رہے تھے۔

خان صاحب بولے:

"چلو! ابھی ہمارے ساتھ چلو اور دِکھاؤ وہ پستول کہاں ہے؟"

"چلیے! وہ جگہ یہاں سے کُچھ اتنی دور نہیں ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور ان دونوں کو ساتھ لے کر گنّے کے کھیت کی طرف چل دیا۔

وہاں پہنچ کر میں نے زمین کھود کر رومال میں بندھا پستول نکال کر اُنہیں دے دیا۔

"ارے یہ تو بھرا ہوا پستول ہے۔ اِس میں سے صرف ایک ہی گولی چلی ہوئی ہے۔" خان صاحب نے پستول کو کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا تھا کہ زلفی یونہی گپ ہانک رہا ہے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ سچّا ہے۔" ترمزی صاحب نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"مگر سوال یہ ہے ترمزی صاحب کہ اسلم کو یہ پستول کیوں دیا۔" خان صاحب ہوئے۔

"اِس کا جواب تو اسلم ہی دے سکتا ہے۔ ہمیں بہ ہر حال فوراً پولیس کو اِطّلاع دینی چاہیے تاکہ وہ سارے مُشتبہ لوگوں پکڑ کر اسلم سے اُن کی

شناخت کروائے۔"ترمزی صاحب بولے۔

"اِنھی لوگوں نے تقی صاحب کا گھر لُوٹا ہے اور اِنھی نے قمرُو کو قتل کیا۔ یہ تو بہت خطرناک سازش معلوم ہوتی ہے ترمزی صاحب۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔" خان صاحب نے کہا۔ "چلیے پھر یہاں سے سیدھے ہم تھانے چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے تقی صاحب کو بھی ساتھ لے لیں۔"

"نہیں۔ اُن کا توصدمے نے بہت بُرا حال کر دیا ہے۔"اُنھیں آرام کرنے دیں۔ اللہ میرے بچّے کو محفوظ رکھے۔ ہمیں اُنھیں جلد از جلد پکڑنا چاہیے۔" خان صاحب یہ کہتے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔

ہم وہاں سے نکل کر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے تھانے جا پُہنچے۔ چیمہ صاحب وہاں موجود ہی تھے۔ اُن کو جب ترمزی صاحب نے ساری باتیں

بتائیں تو وہ حیران رہ گئے۔

بولے:

"کمال ہے۔ یہ لڑکے ایسی ایسی باتیں بھی ہضم کر لیتے ہیں۔ اِس گدھے کو دیکھیں اِس کے پستول نے ہماری تفتیش کا رُخ ہی بدل ڈالا ہے مگر یہ اِسے چھپائے بیٹھا تھا۔ بیٹے! جب بھی کوئی ایسی بات معلوم ہو وہ فوراً پولیس کو بتا دینی چاہیے۔"

"جی میں ڈرتا تھا کہ کہیں میں خود ہی کسی چکّر میں نہ پھنس جاؤں یا میری وجہ سے اسلم پر کوئی حرف نہ آئے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"خیر ٹھیک ہے۔ یہ پستول تو واقعی بہت قیمتی ہے۔ اِسے آپ میرے پاس رہنے دیں اور صُبح نو بجے یہاں آئیں۔ میں شہر کے تمام بدمعاشوں کو

یہاں اکٹھے کر لوں گا۔ پھر یہ لڑکا اصلی مُجرم کو آپ ہی آپ شناخت کر لے گا۔ یہ بات تو طے ہے کہ چوری اور قتل کی واردات ابھی لوگوں کی ہے جن کا یہ پستول ہے۔" حمید صاحب نے کہا۔

"جی بہت بہتر۔ ہم صُبح نو بجے یہاں آ جائیں گے۔" ترمزی صاحب نے کہا۔

جب ہم چیمہ صاحب کے کمرے سے باہر نکلے تو دروازے کے قریب ہی مُجھے ایک آدمی زمین پر سے جلی ہوئی دیا سلائیاں، سگریٹوں کے خالی پیکٹ اور گنڈیریوں کے چھلکے اُٹھاتا نظر آیا۔ مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہماری باتیں بڑے غور سے سُنتا رہا ہے اور اب وہ ہم سب کو بڑی توجّہ سے دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر تو اس کی نظریں بار بار اُٹھتی تھی۔

میں نے گھبرا کر اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کُچھ لوگ خواہ مخواہ دوسروں کے چہروں کو ٹٹولنے لگتے ہیں۔ میں نے سوچا یہ عجیب خاکروب ہے جواِس وقت بھی چین سے نہیں بیٹھتا۔ مگرانہیں ضروراس کا کوئی معاملہ تھانے میں پھنسا ہو گا۔ جب ہی یہ تھانے دار کو خوش کرنے کے لیے اس کے کمرے کے اندراور باہر اِس وقت تک صفائی کرتا پھر رہا ہے۔ اُس کی شکل بھی بالکل غنڈوں ایسی تھی جسے میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے تھانے سے باہر نکل آئے۔ وہ آدمی برابر ہمیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا پاگل ہے۔ اِسے بھلا ہم سے کیا واسطہ۔ ہم اپنے ہی جھنجھٹ میں پھنسے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ ہمیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔

تھانے سے نکل کو ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور سیدھے ہاسٹل جا پُہنچے۔ کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ جوں توں کر کے میں نے زہر مار کیا اور پھر میں خان صاحب اور ترمزی صاحب کو شب بخیر کہہ کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔

کافی دیر تک میں جاگتا رہا۔

رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اسلم پر خُدا جانے کیا گزرتی ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہیں وہ لوگ اُس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ اِن لوگوں سے کُچھ بھی تو بعید نہ تھا۔ یہ ایسی بات تھی جسے سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔ مُجرم کے قبضے میں شکار ہو تو پھر اس کا ہاتھ کون روک سکتا ہے۔ وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ جُوں تُوں کر کے رات کٹی۔ صُبح اُٹھ کر میں نے مُنہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ کسی لڑکے سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔ اُن کا حال بھیڑوں کے اُس گلّے

ایسا تھا جس میں سے ایک بھیڑ جب بھیڑیے کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو باقی بھیڑیں وہاں سے ہٹ کر پھر سر نیچا کر کے چرنے لگتی ہیں۔

اُنہیں یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہاں اُن کا کوئی دوست اسلم بھی رہتا تھا۔ اِس میں اُن کا بھی کوئی قصور نہ تھا کیونکہ اُنہیں ہم نے بتایا ہی نہ تھا کہ اسلم پر کیا گزری ہے۔ وہ تو شاید یہی سمجھے ہوئے تھے کہ اسلم تین دِن کی چھٹّی لے کر گھر گیا ہوا ہے۔

اُس روز میں نے اسکول سے دو گھنٹے کی چھٹی لی اور پھر ترمزی صاحب اور خان صاحب کے ساتھ میں تھانے جا پہنچا۔ چیمہ صاحب ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر تھانے کے پچھلے حصّے میں چلے گئے۔ وہاں بیس کے قریب طرح طرح کی شکلیں بیٹھی تھی۔ کسی کا ایک ہونٹ کٹا ہوا تھا تو کسی کی ایک آنکھ غائب تھی۔ کوئی نسوار کھا رہا تھا تو کوئی

بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ کسی کے بال اُلجھے ہوئے تھے تو کسی نے مُنہ ہاتھ بھی نہ دھویا تھا۔ وہ سب کے سب عادی مُجرم تھے۔ کوئی جیب کُترا تھا تو کوئی ڈاکو۔ کوئی چور تھا تو کوئی راہ زن۔

چیمہ صاحب کو سامنے دیکھ کر وہ سب کے سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

میں نے اُن سب کو باری باری بڑے غور سے گھور گھور کر دیکھا مگر اُن میں وہ آدمی موجود نہ تھا جسے میں جوہڑ پر دیکھ چکا تھا۔

چیمہ صاحب نے میرے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے تو اُنھوں نے ہم تینوں کو واپس آنے کا اشارہ کیا۔ جب ہم اُن کے کمرے کے سامنے پُہنچے تو وہ آدمی جسے میں نے رات بھی وہیں دیکھا تھا دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔

چیمہ صاحب نے اپنی چھڑی سے کمر میں ٹھوکا دے کر اُسے مخاطب کیا اور بولے :

"اوئے گامی! جا دوڑ کر اِن کے لیے چائے لا۔ کُچھ کھانے کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"

"بہت اچھّا ساب جی ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہ کر وہ آدمی فوراً باہر کی طرف لپکا۔

"ترمزی صاحب میں نے اِس معاملے پر جتنا زیادہ غور کیا ہے اُتنا ہی اُلجھ گیا ہوں۔ اب تو مُجھے فکر ہے کہ کہیں وہ لوگ اِس لڑکے کو ہی نہ اُچک لیں۔ ہمیں اس کی پوری حفاظت کرنی چاہیے۔"

"میرے لڑکے کا کُچھ کریں جناب! وہ پتہ نہیں کس حال میں ہے۔" خان

صاحب نے سخت فکر مند لہجے میں کہا۔

"خُدا کرے آپ کا لڑکا جلدی مل جائے خان صاحب۔ ہم نے شہر کے تمام مُشتبہ لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ کئی جگہ چھاپے مارے ہیں مگر پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں۔" چیمہ صاحب بولے۔

"تو کیا پولیس اِس سِلسِلہ میں کُچھ نہیں کر سکتی۔" خان صاحب بولے۔

"جو کُچھ ہمارے بس میں ہے وہ ہم کر رہے ہیں خان صاحب۔ مُجھے تو آپ کا لڑکا ہی قصوروار معلوم ہوتا ہے۔ وہ اِن بدمعاشوں کے کسی جھانسے میں آ کر پہلے ہی دِن غَلط قدم اٹھایا تھا۔ اُس نے جیپسی کو ہلاک کیا۔ اُسی کی مُخبری پر تقی صاحب کا گھر لُٹا اور اُسی کی وجہ سے قمرُو ہلاک ہوا۔ یہ ساری باتیں میں خود اچھّی طرح معلوم کرنے کے بعد آپ سے کہہ رہا ہوں۔" چیمہ

صاحب نے بڑے روکھے لہجے میں کہا۔

"آپ اس وقت جو جی چاہیے کہیں مگر میرا بیٹا بدمعاشوں کا ساتھی نہیں ہو سکتا۔ ایک چودہ سال کے بچّے سے آپ کس طرح ایسی باتوں کی توقّع رکھ سکتے ہیں۔" خان صاحب بولے۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ اُس کی تربیت غلَط تھی یا اُس کی صُحبت خراب تھی۔ کسی نہ کسی طریقے سے وہ اِن بدمعاشوں کے ہتھّے چڑھ گیا اور یہ ساری مُصیبت آئی۔ جب تک ہم اسے ڈھونڈ نہ لیں جب تک کسی نتیجے پر ہم کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

"جناب خان صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اسلم بہت ہی نیک لڑکا ہے۔ اُسے میں نے آج تک کسی ایسے ویسے آدمی کے ساتھ نہیں دیکھا۔" ترمزی

صاحب بولے۔

"مجھے آپ سے پورا پورا اتّفاق ہے ترمزی صاحب۔ اب تو ہمیں اِس لڑکے کی فکر ہے۔ جوہڑ پر جو کُچھ اِس نے خود اُن کی زبان سے سُنا۔ اِس سے تو یہی ظاہر ہے کہ اب وہ اِسے بھی قبضے میں لیں گے۔" چیمہ صاحب نے کہا۔

"اِس کی حفاظت کا کیا انتظام کریں اب۔" ترمزی صاحب بولے۔

"میرا تو خیال ہے کہ اِسے ہاسٹل سے باہر نہ جانے دیں نظروں کے سامنے رکھیں۔" چیمہ صاحب بولے۔

"نہیں جی نہیں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ سامنے آ کر اِسے لے جائیں تاکہ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی وہاں جا پہنچوں۔" خان صاحب نے کہا۔

"نہیں نہیں خان صاحب۔ وہ خطرناک مُجرم ہیں۔ یہ بچّہ نہ میرا ہے نہ آپ کا۔ ہم کیوں اِسے موت کے مُنہ میں بھیجیں۔ ہمیں کوئی اور تدبر سوچنا ہو گی۔" چیمہ صاحب نے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کُچھ نہیں آتا۔ خُدا کے لیے میرے اسلم کو بچا لیں چیمہ صاحب! میری ایک ہی اولاد ہے۔" خان صاحب نے روہانسی آواز میں کہا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ بے حد پریشان نظر آتے تھے۔

اِتنے میں گامی چائے کے برتنوں سے لدی پھندی ٹرے لے کر اندر آ گیا۔ اس نے پیالیوں میں ڈال کر چائے ہم سب کے سامنے رکھی۔ وہ برابر کنکھیوں سے مُجھے اور ترمزی صاحب اور خان صاحب کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

جانے کیا بات تھی مُجھے اُس کی صورت سے ہی نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ کوئی بہت ہی عیّار اور چال باز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چُپکے سے خان صاحب کے کان میں کہا:

"یہ شخص تو مُجھے بہت ہی خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔"

"مُجھے بھی یہی لگتا ہے۔ کسی کیس میں پھنسا ہوگا جب ہی اِن کی خدمت کر رہا ہے۔" خان صاحب نے سرگوشی کی۔

چائے ہمارے سامنے رکھ کر گامی باہر دروازے پر جا بیٹھا تو خان صاحب نے دبی آواز میں کہا:

"یہ آدمی کون ہے جو آپ کے دروازے پر رہتا ہے؟"

"اِس کے بھائی پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ بس میرے دروازے پر آ کر بیٹھا رہتا ہے اِس اُمّید پر کہ شاید میں اِس کی کُچھ مدد کر سکوں۔ خود بھی یہ کسی زمانے میں بستہ ب کا بدمعاش رہا ہے۔" چیمہ صاحب بولے۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے چیمہ صاحب۔ یہ معاملہ تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔ ہمیں تو اب لڑکے کی فکر لگی ہے۔" ترمزی صاحب نے کہا۔

"کیوں بھئی زُلفی وہ آدمی جس کا نام تُم نے ٹِکّا بتایا ہے کیا کہتا تھا؟" حمید صاحب نے کہا۔ "جی وہ کہتا تھا کہ اب اِس کے دوست کو بھی پکڑو کیونکہ پستول بہت قیمتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹِکّا کے ساتھی کا کیا نام ہے؟"

"اُس کا نام راجو ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھّا تُم آج اسکول سے چھٹّی کے بعد فوراً یہاں آ جاؤ۔ پھر میں دو سپاہی سفید کپڑوں میں تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ بھی آ جائیں خان صاحب۔ زُلفی بازاروں میں دو گھنٹے تنہا پھرے گا۔ وہ ٹِکّا ضرور اُسے کسی نہ کسی بہانے سے اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے سپاہی اُس کے پیچھے چل دیں گے اور اُس کے ٹھکانے پر اسے جا پکڑیں گے۔"

"میں تو یہ سارا وقت دوپہر تک یہیں گزاروں گا۔ ترمزی صاحب آپ زُلفی کو چھٹّی کے بعد یہاں بھیج دیں۔" خان بولے۔

"جی بہت بہتر۔ میں اِسے دوپہر کو بھیج دوں گا۔" یہ کہہ ترمزی صاحب مُجھے اپنے ساتھ لے کر اسکول کی طرف چل دیے۔

جب ایک بجے اسکول سے چھٹّی ہوئی تو مُجھے ترمزی صاحب کہیں نظر نہ

آئے۔ اُنہیں تقی صاحب نے کسی سرکاری کام کے سِلسلے میں باہر بھیجا تھا جہاں سے وہ اُس وقت تک واپس نہ آئے تھے۔

میں نے سوچا کہ تھانہ کوئی سو کوس دور تو نہیں ہے میں خود وہاں چلا جاتا ہوں۔ خان صاحب تو وہاں موجود ہی ہیں۔ کوئی تر نوالہ تو میں ہوں نہیں جسے ٹِکّا سڑک پر سے اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لے گا۔ مُجھے اپنے دوست کو اِس مُصیبت سے بچانے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے۔

یہ سوچ کر میں نے بستہ تو ہاسٹل میں رکھا اور وہاں سے نکل کر میں سیدھا سڑک پر جا پہنچا۔ اب میں اپنے ارد گرد چلتے ہوئے ہر شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی بھی آدمی کو مُجھ سے کوئی دِل چسپی نہ تھی۔ اسکول سے تھانہ ایک میل دور تھا۔ میں تیز تیز قدیم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک کُچھ فاصلے فاصلے پر ایک رکشا رُکا اور اُس میں سے لاٹھی ٹیکتی ہوئی ایک بُڑھیا

اُتری۔ رکشا اُسے وہاں اُتار کر آگے نکل گیا۔ بُڑھیا اندھی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بے بس ہو کر کھڑی ہو گئی۔ کئی آدمیوں سے اُس نے کہا کہ وہ اُس کی مدد کریں مگر سب لوگ اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجّہ نہ دی۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو میرے قدموں کی چاپ سُن کر اس نے بُلند آواز سے کہا:

"بیٹا مُجھے اندھی کو گھر پہنچا دو اللہ تمہیں سُکھی رکھے۔"

"آپ کو کہاں جانا ہے ماں جی؟" میں نے اس کے قریب رُک کر کہا۔

اُس کی حالت بڑی ہی قابلِ رحم تھی۔ اس نے اچھّے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے مگر آنکھوں معذور ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی پریشان تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلّق

رکھتی ہے۔

"میرا گھر مُسلم کالونی میں ہے بیٹا۔ میرے پیسے کہیں کھو گئے ہیں جس کی وجہ سے رکشے والے نے مُجھے یہیں اُتار دیا۔"

"ارے مسلم کالونی تو یہاں سے کافی دور ہے ماں جی۔ آپ پیدل کیسے جائیں گی وہاں تک؟"

"بیٹا مُجھے رکشے میں بِٹھا کر گھر تک پہنچا دو۔ میں بہُو سے لے کر پیسے دے دوں گی۔" وہ بڑُھیا بولی۔

اُس کی آنکھوں سے ٹِپ ٹِپ آنسو بہنے لگے۔ میں کتنی ہی دیر سے پریشان ہو رہی ہوں بیٹا۔ گھر سے دوا لینے نکلی تھی کہ پیسے بھی گنوا بیٹھی۔ پھر راستہ بھول کہ کہاں سے کہاں جا پہنچی۔"

اُس کی یہ حالت دیکھ کر مُجھے بڑا ترس آیا۔ میں نے ایک رکشا ٹھہرایا اور کہا :

"چلیں ماں جی۔ میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اُس بڑھیا کو رکشے میں سوار کیا اور ہم مسلم کالونی کی طرف چل دیے۔

بڑھیا مُجھے دعائیں دیتی رہی :

"تمہارا بھلا ہو بیٹے۔ خُدا تمہارا اقبال بُلند کرے۔ تمھیں خُدا بڑا افسر بنائے۔"

وغیرہ وغیرہ۔

اب تو اس کی وہ ساری دعائیں مُجھے یاد بھی نہیں رہیں۔ بس قینچی کی طرح زبان چلتی تھی اس کی اور وہ یوں ظاہر کہ رہی تھی جیسے وہ میری بہت زیادہ احسان مند ہے اور زلفی سے زیادہ اچھّا لڑکا اِس دُنیا میں کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

میں کہتا ہی رہا کہ :

"ماں جی یہ تو میرا فرض تھا کوئی احسان تو نہیں کیا میں نے۔"

مگر وہ تو بس مُجھے آسمان پر چڑھا رہی تھی۔ میری تعریفوں کے پُل باندھتی رہی اور رکشا چلتا رہا۔

مسلم کالونی وہاں سے تین میل دور تھی۔ وہ فاصلہ طے کر کے جب ہم بُڑھیا کے کہنے کے مطابق نور محلّے میں داخل ہوئے تو ایک دو منزلہ مکان

کے قریب پہنچ کر وہ بُڑھیا بولی :

"بیٹا مُجھے بہار شاہ کے مکان پر اُتار دو۔"

اور جب میں نے غور سے دیکھا تو اس مکان پر بہار شاہ کے نام کی تختی لٹک رہی تھی۔

"بہار شاہ کا مکان تو یہی ہے ماں جی۔" میں نے کہا۔

"بس یہیں رکشا روک لے بیٹا۔ اور میں پیسے دیتی ہوں تُم اِسی رکشے میں واپس چلے جانا۔"

یہ کہہ کر وہ بُڑھیا رکشے سے اُتر کر راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگی۔

میں ابھی تک رکشے میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ بُڑھیا پھر رُک گئی اور بولی :

"بیٹا مُجھے اندر تو پہنچا دو۔"

اُس کی یہ بات سُن کر میں آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر میں اسے مکان کے دروازے تک لے گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا اُسے کھول کر ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک چھتی ہوئی صاف ستھری ڈیوڑھی تھی۔ کوئی بیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بُڑھیا بولی :

"بھُواری او بھُو دیکھ میں واپس آ گئی۔"

اُس کی آواز سنتے ہی ایک جوان عورت دائیں ہاتھ کے کمرے سے باہر نکلی اور بولی :

"اری امّاں میں تو سمجھی کہ تُجھے بھی کوئی اُٹھا کر لے گیا۔ اچھّا تو یہ لڑکا لایا ہے تمھیں۔"

"ہاں تو جا کر تھوڑی چائے بنا مگر پہلے رکشے والے کو فارغ کر دے۔"

بُڑھیا نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی:

"بیٹا دو گھونٹ چائے پیتے جاؤ۔"

"نہیں ماں جی مُجھے دیر ہو جائے گی میں جا رہا ہوں۔" میں نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

مگر ابھی میں ڈیوڑھی میں آدھا فاصلہ بھی طے نہ کر سکا تھا کہ وہ جوان عورت بھاگ کر آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے بولی: "بھائی چائے پیئے بغیر نہ جانے دوں گی۔ رکشے بہت مل جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ مُجھے کھینچتی ہوئی ایک کمرے میں لے گئی۔ جس میں بڑا ہی مختصر سا سامان رکھا تھا۔ دو چارپائیاں تھیں جن پر چادریں بِچھی تھیں۔ دائیں

طرف دو کرسیاں اور ایک میز بھی تھی۔

وہ عورت مُجھے وہاں بِٹھا کر باہر نکل گئی۔ مکان تو وہ بہت اچھّا نظر آتا تھا مگر وہاں کمروں میں ایسی بے سروسامانی تھی جس سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ لوگ کُچھ ایسے خُوشی حال نہیں ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عورت واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ بولی:

"لے بھائی یہ دودھ پی لے۔ چائے بنانے میں تو دیر لگتی۔ کہاں میں آگ جلاتی کہاں میں چائے پکاتی اور دیر پھر تُجھے جانے کی جلدی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دودھ کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا دیا۔ میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ کوئی چیز وہاں سے کھاؤں مگر وہ عورت اتنے میٹھے لہجے میں بات

کرتی تھی جیسے وہ میری سگی بہن ہو۔ اُس کے کہنے پر میں نے وہ گلاس مُنہ سے لگا لیا۔

اور جب میں وہ دودھ پی چُکا تو میرا سر ایک دم چکرانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ گھوم رہا ہے۔ چند لمحوں تک یہ کیفیت قائم رہی پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ مُجھے بالکل ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

اور جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو کسی اور ہی کمرے میں بند پایا۔ میں ٹھنڈے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک تنگ سا کمرہ تھا جس میں دائیں طرف ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو اندر سے بند تھی اور اِس کھڑکی کے اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جہاں سے ہوا اندر آتی تھی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو اُسے بھی بند پایا۔

اب ساری بات مُجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ وہ بُڑھیا وہ مکّار عورت مُجھے اندھی بن کر اپنے جال میں پھانس چکی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے مُجھے کیا دُشمنی ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا جس کی وجہ سے وہ مُجھے سے ایسا سلوک کر رہی تھی۔ میں نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کیا۔

مُجھے اتنا طیش آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دروازہ توڑ ڈالوں۔ کتنی ہی دیر تک میں دروازے پر سکتے مارتا رہا مگر کسی نے بھی توجّہ نہ دی۔

پتہ نہیں وہ کون سی جگہ تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو مُجھے وہاں بند کر گئے تھے۔

آخر وہ مُجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

اُنہیں مُجھ سے کیا خطرہ ہے۔

میں نے تو کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں کیا۔

اور وہ مکان بہار شاہ کا تھا جہاں میں اترا تھا اور وہ وہ بُڑھیا اندھی تھی جس کی میں نے مدد کی تھی۔ عورت جس نے مُجھے دودھ کا گلاس دیا تھا۔ کتنے میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی۔ بات بات پر مُجھے بھائی کہہ کر پُکارتی تھی۔ اِن لوگوں کو مُجھ سے کیا بیر ہو سکتا ہے۔ بہار شاہ کا تو نام ہی میں نے پہلی دفعہ سُنا تھا، وہ ٹِکّا اور راجو تو اِس معاملے میں بالکل ہی بے تعلّق نظر آتے تھے۔

پھر میں نے سوچا۔

ہو سکتا ہے کہ اُسی بد بخت نے مُجھے پکڑنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہو۔

یہ خیال میرے لیے سخت پریشانی کا موجب تھا کیونکہ وہ ایسے لوگ تھے جو مار دھاڑ اور قتل و غارت سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

میں نے مایوس ہو کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اب میرے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ میں کسی اور ہی جگہ پر بند تھا۔ وہ کمرہ جہاں میں کھڑا تھا مکان کی دوسری منزل پر تھا اور زمین سے بیس فِٹ اونچائی پر تھا۔

یا پیر دستگیر یہ میں کس جگہ پر آ پہنچا ہوں اور کون مُجھے یہاں لایا ہے۔

کھڑکی سے ہٹ کر میں پھر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے میں سے سامنے دیکھنے لگا۔ کمرے کے بالکل سامنے کُھلی چھت تھی جس کے عین درمیان میں سیڑھی تھی جو نیچے اُترتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر پوری قوّت سے دروازے کو ہلایا تو مُجھے سیڑھیوں میں کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔

میں دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا آدمی سیڑھیوں میں نمودار ہوا۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

وہ ٹِکّا خان تھا۔

وہی ٹِکّا خان جسے میں جوہڑ پر دیکھ چکا تھا۔

سیڑھیوں میں سے نکل کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے کا تالا کھولنے لگا۔

میں اُسے دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ جی چاہتا تھا میں کھڑکی میں سے باہر چھلانگ لگا کر مر جاؤں۔

مگر پھر میں نے سوچا کہ نہیں۔ مُجھے اس مُصیبت کا مردانہ وار مُقابلہ کرنا چاہیے۔ آخر یہ لوگ مُجھ سے چاہتے کیا ہیں۔

دروازہ کھول کر ٹِکّا خان اندر نہیں آیا بلکہ جیب سے نکال کر اُس نے اپنا خنجر دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولا:

"تُجھے ہوش آ گیا ہے لڑکے؟"

میں اُس کی یہ بات سُن کر بالکل خاموش رہا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھتا رہا۔

"کیا نام ہے تیرا۔" وہ بولا۔

"ذوالفقار۔" میں نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ پستول کہاں ہے جسے تُو نے جوہڑ سے نکالا تھا؟" وہ بولا۔

"تُم کیوں پوچھتے ہو؟"

"میری بات کا جواب دو۔ وہ پستول کہاں ہے؟"

یہ کہہ کر وہ ایک دم میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ خنجر اُس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔

"وہ میں نے چیمہ صاحب کو دے دیا ہے۔" میں نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔ چیمہ صاحب کو دے دیا ہے۔ وہ سالا لگتا تھا اُس پستول کا۔ جب تک وہ پستول نہیں ملتا میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تُم نے مُجھے

تھانے کے اندر شناخت پریڈ میں پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ مجھے تُم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"جوہڑ پر۔ جب تُم پستول تلاش کر رہے تھے۔ پھر جب تُم اسلم کو لے کر وہاں راجو کے ساتھ آئے جب بھی میں وہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھّا تو تُم یوں ہمارا پیچھا کرتے رہے ہو۔ اچھّا ہوا جو تُم یہاں آ گئے۔ ورنہ تو تُم ہمارا کباڑا ہی "اسلم کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُسے ہم نے اپنے کام پر لگا دیا ہے۔ تُم بھی اب وہی کام کرو گے۔ اگر ہمارا کہنا نہیں مانو گے تو تمہاری گردن کاٹ دیں گے ہم۔" وہ بولا۔

"بے شک کاٹ دو گردن مگر میں تمہارا کہا نہیں مانوں گا۔ تُم چور ہو ڈاکو ہو قاتل ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"بالکل غلَط بات ہے۔ ہم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔" وہ مُسکراتا ہوا بولا۔

"تُم نے تقی صاحب کا گھر لُوٹا۔ پھر قمرُو کو قتل کیا۔ پھر اسلم کو اغوا کیا۔ اب تُم مُجھے بھی فریب دے کر پکڑ لائے ہو۔ مگر تُم بچ نہیں سکتے۔ میں پولیس کو سب کُچھ بتا دوں گا۔" میں نے بُلند آواز سے کہا۔

"تمہیں اب پولیس تک ہم کبھی نہ پہنچنے دیں گے۔ یہاں کی پولیس ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم نے قمرُو کو قتل نہیں کیا نہ ہم نے تقی صاحب کے گھر کو لُوٹا ہے۔ یہ باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں۔" وہ اب کی بار بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"چیمہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ تُم نے اسلم

کو دھوکا دیا۔ اس کے ہاتھ سے جیپسی کو مروایا کیونکہ وہ کتّا تمہاری پیش نہیں چلنے دیتا تھا۔ تُم نے پہلے اُسے راستے سے ہٹایا۔ پھر تقی صاحب کا گھر لُوٹا اور اُن کے گھر کی کنڈی تُم نے پہلے ہی قمرُو سے کھلوالی تھی۔" میں نے کہا۔

" بکواس بند کر چھوکرے۔ تُو تو بہت ہی خطرناک لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ میں تیرا قیمہ کر دوں گا۔ خبردار جو پھر تو نے ایسی باتیں کیں تو۔"

"میں سچّی بات ضرور کہوں گا خواہ میری گردن ہی کیوں نہ کٹ جائے۔ تُم نے اِس ڈر سے کہ کہیں میں تمہیں پکڑوا نہ دوں مُجھے دھوکے سے پکڑ لیا ہے۔ مگر تُم پولیس سے نہیں بچ سکتے ہو۔"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کر۔ یہ تیرے باپ کا گھر نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک زبردست طمانچہ میرے مُنہ مارا اور جیب سے ایک مضبُوط ریشمی ڈوری نکال کر اُس نے اپنا خنجر دانتوں میں دبایا اور میرے دونوں ہاتھ ڈوری میں جکڑنے کے لیے اُس نے پکڑ لیے۔

میں بالکل خاموش رہا۔

وہ سمجھا کہ میں خوف زدہ ہو چکا ہوں۔ ابھی وہ پہلی گرہ باندھ ہی رہا تھا کہ میں نے پوری قوّت سے اُس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ اِس حملے کے لیے بالکل تیّار نہ تھا۔ ایک دم وہ تیورا کر پیچھے ہٹا اور گِر پڑا۔ میرے ہاتھ ابھی آزاد تھے۔ ڈوری نیچے گِر گئی تو میں نے ایک دم آگے بڑھ کر زمین پر سے وہ خنجر اُٹھا لیا جو پیٹ میں لات لگنے کی وجہ سے آپ ہی آپ اس کے دانتوں سے نکل گیا تھا۔ خنجر میرے ہاتھ میں دیکھتے ہی وہ اُٹھا اور چارپائی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر اس نے پوری قوّت سے مُجھے پر پھینکا مگر میں

بھاگ کر دوسری طرف ہو گیا۔ میری آنکھوں میں خُون اُتر آیا تھا۔ میں نے خنجر کو سکاؤٹوں کی تربیت کے مطابق نوک سے پکڑ کر بڑے خونخوار انداز سے پیچھے ہٹ کر اُس کی طرف پھینکا۔ بس یہی میری غَلطی تھی۔ وہ ایک دم طرح دے گیا اور خنجر کھُلی کھڑکی میں سے نکل کر باہر جا گرا۔

اب وہ غرّاتا ہوا میری طرف بڑھا اور اُس نے مُجھے بازوؤں سے پکڑ کر ایک دم دھان کی بوری کی طرح زمین پر دے مارا۔ پھر اس نے کُچھ اس طرح مُکّوں اور طمانچوں کی بارش برسائی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ وحشی درندے کی طرح مُجھے مار رہا تھا کہ اچانک آدمی کمرے میں آئے۔ اُن میں سے ایک وہی راجو تھا جسے میں جوہڑ پر دیکھ چکا تھا۔

"ارے خان صاحب کیا کرتے ہیں آپ۔ اِسے مار ہی دیں گے آپ۔"

راجو نے ٹِکّا خان سے مُجھے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جا پیچھے راجو۔ اِس نے مجُھ پر خنجر سے حملہ کیا ہے۔ میں اِس کی ہڈّیاں توڑ دوں گا۔ ایسا ہتھ چھُٹ لونڈا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" ٹِکّا خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

راجو نے مجُھے اُس کی گرفت سے چھیڑا تو لیا تھا۔ مگر ٹِکّا خان کا غصّہ ابھی تک نہ اُترا تھا۔ اُس نے راجو کو پرے دھکیل کر پھر ایک زور دار طمانچہ میرے مُنہ پر بارا۔ اس پر راجو نے ٹِکّا خان کو بڑے طیش سے دیکھا اور کہا :

"یار یہ بڑے کام کا لڑکا ہے اسے کیوں مارنے پر تُلے ہو۔"

"بھیڑ کے خُون سے کوئی پھانسی نہیں چڑھتا راجو۔ زندگی میں پہلی بار مجُھے ایسے لڑکے سے پالا پڑا ہے۔ باندھ دے اسے۔"

یہ کہہ کر اُس نے راجہ کی مدد سے میری مشکیں کس دیں اور کُچھ اِس طرح مُجھے اِن دونوں نے باندھا کہ میں ہِل نہ سکتا تھا۔ میری دوٹانگیں گردن کے اُوپر رکھ کر باندھی گئیں۔ پھر اُنھوں نے میرے دونوں ہاتھ میری کمر کے پیچھے یوں باندھے کہ میں بالکل اُردُو کا آٹھ بن کر رہ گیا۔ میرے مُنہ میں ٹِکّا خان نے اپنا رومال باندھ کر گیند کی طرح فرش پر لڑھکا کر دیوار کے ساتھ ٹِکا دیا۔

"اِس نے ہمارا پستول اپنے باپ چیمہ صاحب کو دے دیا۔ میں تو اِس کی ہڈّیاں توڑ دوں گا۔ یہ سمجھتا کیا ہے آخر۔ وہاں تھانے میں اگر میں یا تُم موجود ہوتے تو اِس نے تو کباڑا کر دیا تھا ہمارا۔"

"اب تحمّل سے کام لو اُستاد۔ میں اِس سے اور بہت سی باتیں پوچھ لوں گا پھر اِس کا جھٹکا کر دیں گے۔"

"پتہ ہے کیا کہا ہے اِس نے۔ کہتا تھا قمرُو کو ہم نے قتل کیا ہے۔ وہ اُلّو کا پٹھّا پتہ نہیں کِس کے ہاتھوں مرا۔ اُس کا الزام بھی یہ ہم پر دھرتا ہے۔ پھر کہتا ہے چوری بھی اُس ہیڈ ماسٹر کے گھر میں ہم نے کی ہے۔ کترنی کی طرح زبان چلتی ہے اِس کی۔" "اچھّا۔ کمال ہے۔ اتنی ساری باتیں بتائی ہیں اِس نے تمہیں۔ یہ تو سنپولیا ہے سالا۔" راجو بولا۔

"بس اِسی لیے تو مُجھے طیش آگیا۔ یہ ہماری تلاش میں روز اُس جوہڑ پر جاتا رہا ہے۔ خُدا کی قسم یہ تو ہمیں لے ڈوبتا۔ کل صُبح تک اِسے زمین کے نیچے اُتار دو۔ ورنہ خود اِس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"ایسا ہی ہو گا اُستاد تُم فکر نہ کرو۔ اِس کا یہاں آنا تو بہت ہی ضروری تھا۔"

"ضروری سا ضروری۔ اِس نے مُجھے بھی حواس باختہ کر دیا ہے۔ لعنتی

کہیں کا۔ چلا تھا جاسوس بننے۔"

یہ کہہ کر ٹِکّا خان نے ایک قہر آلود نگاہ مُجھ پر ڈالی اور راجو کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دروازے پر تالا لگا کر سیڑھیوں کی طرف چل دیے تو مُجھے ایک دم اُس کمرے سے خوف آنے لگا۔ جب تک وہ دونوں وہاں موجود رہے مُجھے قطعاً کوئی خوف نہ آیا تھا۔

مُجھے ابّا جان کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بدمعاش اور غُنڈے لوگ جو بہت زیادہ چیخ چیخ کر اور گرج گرج کر باتیں کرتے ہیں بڑے ہی بزدل ہوتے ہیں۔ ذرا سی عقل مندی اور ہوشیاری سے کام لیا جائے تو اِن کو پکڑنا کُچھ بھی مُشکل نہیں ہوتا۔ مگر اب تو میں کمرے میں بالکل جانور کی طرح بندھا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں وہاں سے نکلوں گا کیسے!

کس ڈھٹائی سے ٹِکّا خان میرے سامنے خود کو بے قصور ثابت کر رہا تھا۔ کہتا تھا کہ میں چوری اور قتل کا الزام اُن پر خواہ مخواہ لگا رہا ہوں۔ وہ مُجھے سے اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا جیسے زندگی اور موت پر اُسے اختیار حاصل ہو چکا ہو۔

میرے دِل و دماغ پر جو خوف طاری تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ شام سر پر آ رہی تھی۔ مُجھے اُنھوں نے کُل دوپہر بے ہوش رکھا تھا۔ بہار شاہ کے مکان پر دُودھ پینے کے بعد سے لے کر میں ٹِکّا خان کے آنے تک بے ہوش رہا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اُس نے بڑی بے دردی سے مارا تھا مُجھے۔ بھوک کی وجہ سے پیٹ کمر کے ساتھ لگ چکا تھا۔

اِس پٹائی کی وجہ سے اب پیاس بھی شدید ہو چکی تھی۔ اور وہ رسّی کے جکڑ بند میرے خُون کی گردش میں رُکاوٹ بن رہے تھے۔ گردن پر دونوں ٹانگوں کے بوجھ کی وجہ سے بدن میں سخت اینٹھن محسوس ہوتی تھی مگر وہ

رسّی کُچھ اتنی مضبُوطی سے بندھی تھی کہ میں ذرّہ بھر جنبش نہ کر سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگا۔ مُجھے اُمّید تھی کہ وہاں پر اسلم سے میری ملاقات ضرور ہوگی مگر اسلم کا وہ ذکر تک نہ کرتے تھے جیسے وہ اِس نام سے ہی واقف نہیں ہیں۔

رات بھر میں اِسی طرح ٹھنڈے فرش پر بندھا ہوا پڑا رہا۔ کسی نے اُوپر آ کر نہ پوچھا نہ دیکھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ میرے لیے وہ تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں جاگتا رہا مگر پھر نیند نے مُجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری آنکھ جب کھُلی تو صُبح ہو چکی تھی۔

یُوں لگتا تھا جیسے وہ مکان آبادی سے بہت کسی جنگل میں بالکل تنہا کھڑا ہے۔ کیونکہ کھڑکی تا حدِّ نگاہ کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے۔ مکان کا بڑا

دروازہ کس طرف تھا اِس کا مُجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

سورج کی کرنیں کھڑکی کے اندر جھانکنے لگی تھیں۔ اچانک اس کمرے کا دروازہ کھُلا۔ کوئی دبے پاؤں اُوپر آیا تھا اور بڑی آہستگی سے تالا کھولتا رہا تھا۔

مُجھے پتہ بھی نہ چلا تھا کہ کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ میری ہی عُمر کا ایک لڑکا تیزی سے اندر آیا اور ایک رومال میں بندھی ہوئی تین روٹیاں میرے سامنے رکھ کر بولا:

"یہ کھا لینا۔ اسلم کہتا ہے کہ آج رات وہ تمہیں یہاں سے نکالے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے میرے مُنہ پر سے رومال کھول دیا پھر اُس نے رسّی کی گرہ ڈھیلی کر کے میرے دونوں ہاتھ ٹانگیں آزاد کیے اور جب اُس نے

گردن پر سے میری ٹانگیں اُتار کر سیدھی رکھیں تو مُجھے ایک دم چکّر آنے لگے۔ میں نے بڑی مُشکلوں سے خود کو سنبھالا۔

اور کہا:

"اسلم کہاں ہے؟"

"وہ یہاں ہی ہے مگر دِن کے وقت وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ میں اب چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ واپس مُڑا تو میں نے کہا:

"تُم کون ہو؟" اس پر وہ بولا:

"یہ ساری باتیں بعد میں ہوں گی۔ تُم یہ رسّیاں پہلے کی طرح لپیٹ لینا تا کہ

کسی کو شک نہ پڑے۔ ہم رات کو بارہ بجے آئیں گے۔"

"مگر وہ تو مُجھے آج قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ ابھی کُچھ نہیں کریں گے۔ اُن سے لڑائی مت کرنا بس جس طرح وہ کہیں اُسی طرح مان لینا ورنہ وہ تمہیں پھر ماریں گے۔"

"بہت اچھّا۔ مگر مُجھے تو پیاس لگی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ وہ تو میں بھول ہی گیا۔ یہ لو میں بوتل میں پانی بھی لایا تھا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر مُجھے دے دی اور پھر وہ تیز تیز قدم ہوا باہر نہ نکلا۔ بڑی احتیاط سے اُس نے دروازہ بند کیا اور پھر دبے پاؤں چلتا ہوا وہ نیچے اُتر گیا۔

میں جلدی جلدی وہ روٹیاں سات دِنوں کے بھوکے کی طرح پیٹ میں اُتارنے لگا۔ روٹیوں پر ساگ رکھا ہوا تھا۔ وہ ایسا مزیدار معلوم ہوا کہ میں لُقمے کھٹا کھٹ حلق سے نیچے اُتار کر پانی پینے لگا۔ چھوٹی سی بوتل تھی۔ میں نے سوچا کہ کُچھ پانی بچا کر رکھ لوں تو بہتر ہے۔ پھر پیاس لگے گی تو کام آئے گا مگر وہ تھا ہی کتنا۔ میں سارے کا سارا پی کر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اِس جیسی بیس بوتلیں بھی ہوتیں تو میں پی جاتا۔

۴

وہ لڑکا خُدا اس کا بھلا کرے مُجھے نئی زندگی عطا کر گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا اور اسلم کو اِن لوگوں نے کس حال میں رکھا تھا۔

یہ ساری باتیں میرے لیے معمّا بن چُکی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ آخر میرا گناہ کیا تھا۔ کس جُرم کی پاداش میں اِن لوگوں نے مُجھے بھرے بازار سے اُٹھا لیا تھا۔ خُدا بیڑا غرق کرے اُس بڑھیا کا۔ مُجھے یقین ہو چکا تھا کہ آفت کی پر کالہ اندھی نہیں تھی بلکہ جان بوجھ کر اندھی بنی ہوئی تھی۔ اُس نے مُجھے کسی طرح پہچانا۔ کس فریب سے اُس نے مُجھے رکشے میں اپنے ساتھ

بِٹھایا۔ کتنی دُعائیں دیتی تھی وہ۔

یہ ساری باتیں مُجھے خواب معلوم ہوتی تھیں مگر وہ ایسی حقیقت تھی جس نے مُجھے بے بس کر دیا۔ اُنہیں اگر غصّہ آ جائے اور وہ ابھی آ کر میرے پیٹ میں چھرا گھونپ دیں تو کیا ہو۔ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکے گا کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔

دِن کے دس بجے ہوں گے جب مُجھے سیڑھیوں میں کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اسی وقت میں نے جلدی جلدی پہلے کی طرح اپنے بدن پر رسّیاں لپیٹ لیں اور جوں تُوں کر کے اُن کی گرہیں باندھ کر میں اُردُو کا آٹھ (۸) بن کر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ تالا کھول ہی رہا تھا کہ میں پہلے کی طرح فرش پر گٹھڑی بن چُکا تھا۔

دروازہ کھُلا تو راجو اندر داخل ہوا۔

"ارے تو ابھی تک بندھا پڑا ہے۔ سچ مچ بڑا ظالم ہے یہ ٹِکّا خان۔"

یہ کہہ کر وہ میری رسّیاں کھولنے لگا۔

"بھئی گرہ تو ایک بھی ایسی نہیں جو ذرا زور لگانے سے نہ کھُل سکتی۔ تو بھی نِرا اُبدّھو ہی ہے۔ میں تیری جگہ ہوتا تو فوراً اپنے پیر چھڑا لیتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے میرے مُنہ پر سے رومال اُتار دیا۔ اور پھر میرے قریب بیٹھ کر بولا:

"یار تیرا نام ذوالفقار ہی ہے نا؟"

"ہاں یہی میرا نام ہے۔"

"سُنا ہے تیرا باپ بڑا امیر آدمی ہے۔ اُس کی کوئی فیکٹری بھی ہے۔" "ہاں وہ صابن کی فیکٹری کے مالک ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تو بڑا مال ہو گا اُس کے پاس ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں ہے تو۔ پھر تُم سے مطلب؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ تُو اب ہماری قید میں ہے۔ ہمارے قبضے میں تیری جان ہے۔ اگر تیرے ابّا کو تیری زندگی عزیز ہے تو وہ ہمیں تیس ہزار روپیہ نہیں بھجوا دے گا؟"

"ہاں ہاں درختوں سے روپیہ لگا ہے نا جو میرے ابّا وہاں سے اُتار کر تمہیں دے دیں گے۔" میں نے بڑے غُصّے سے کہا۔

"ناراض نہ ہو یار۔ اپنا تو یہ کاروبار ہے۔ وہ ذرا اپنا بٹوا ڈھیلا کرے تو ہم

بھی تیرے پَر کھول دیں گے ورنہ تو جانتا ہے اِس پستول کی ایک ہی گولی تیرا کام آسان کر سکتی ہے۔"اُس نے اپنی جیب سے پستول نکال کر مجھے دِکھاتے ہوئے کہا۔

"تُم اِسے کاروبار کہتے ہو۔ لعنت ہے تُم لوگوں پر۔ آخر تُم پولیس کے ہتھّے چڑھو گے۔"میں نے پستول دیکھ کر لرزتے ہوئے کہا۔

"اچھّا تُم اپنے باپ کا پتہ لکھواؤ۔ ہم خود اس سے بات کر لیں گے۔ اگر تُم نے کوئی ہینکی پھینکی کی تو مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ ٹِکّا خان تو طمانچے مارتا ہے نا مگر میں خُون ہی چوس لیا کرتا ہوں۔"

یہ کہ کر اُس نے پستول جیب میں رکھا اور قلم کاغذ نکال کر میرا مُنہ تکنے لگا۔

"اگر میں پتہ نہ بتاؤں تو؟"میں نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"توپھر سمجھ لو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"توجاؤ پھر میں اپنے ابّا کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔"

مگر ابھی یہ بات میں کہہ بھی نہ پایا تھا کہ اس نے اپنا بڑا سا پنجہ کھول کر میری گردن دبوچ لی اور میرا نرخرہ اتنی شدّت سے اُس نے دبایا کہ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میری آنکھیں اُبل کر باہر نکلنے لگیں۔ سانس نیچے کا نیچے اور اُوپر کا اُوپر رہ گیا۔

اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو میں ایک دم نِڈھال سا ہو گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ مُجھ سے کوئی ہینکی پھینکی نہ کرنا۔ بتا تیرے باپ کا کیا ایڈریس ہے؟ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ اچانک اس کا ہاتھ میری جیب سے ٹکرایا تو اسے چھوٹی سی بوتل وہاں چھُپی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ابے یہ کیا ہے تیری جیب میں اور یہ تیرے دانتوں میں ساگ کیا پھنسا ہے۔ ہائیں اور یہ زمین پر بھی ساگ گِرا ہے۔ تُجھے کسی نے روٹی دی ہے۔ بول اُلّو کے پٹھّے کس نے تُجھے روٹی دی ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک دم پھر مُجھے گلے سے دبوچ لیا۔

"خُدا کے لیے میرا گلا نہ دباؤ۔" میں نے ایک دم خوف زدہ ہو کر کہا۔

"بتا پھر کس نے روٹی دی ہے تُجھے۔ تیری رسّی کی گرہیں بھی ہم نے اتنی کمزور نہیں باندھی تھیں۔ بتا کون آیا تھا تیرے پاس؟ بول کس نے تیری رسّیاں کھولی تھیں؟"

"مُجھے نہیں پتہ وہ کون تھی۔ ایک بوڑھی سی عورت آئی بھی یہاں۔ کہتی تھی مُجھے راجو نے بھیجا ہے؟"

"تُو جھوٹ بولتا ہے۔ اُلّو کے پٹھّے یہاں عورت تو آنکھ میں ڈالنے کے لیے نہیں ملتی۔ توکہتا ہے بوڑھی عورت تھی۔ سچ سچ بتا کون تھا وہ؟"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور قمیص اُٹھا کر اُس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا چابک کھول کر سیدھے ہاتھ میں پکڑلیا اور بولا:

"میں تیری چمڑی اُدھیڑ دوں گا بچّے۔ تو سمجھتا کیا ہے ہمیں۔ بول کون آیا تھا یہاں؟"

"میں سچ کہتا ہوں کہ یہاں ایک عورت آئی تھی۔" میں نے اب کی بار زمین پر سے اُٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر کہا۔

میری یہ بات سُن کر اُسے ایک دم طیش آگیا اور اس نے پوری قوّت چانک میری کمر میں مارا جو میرے بدن میں زخم پر نمک کی طرح دھنسا مگر

چابک لمبا تھا۔ وہ میری کمر سے لپٹ گیا۔ اُس نے مُجھے ایک جھٹکے کے ساتھ آگے کھینچا اور پھر پوری قوّت سے اُس نے میرے پیٹ میں لات جما کر مُجھے پیچھے گِرا دیا۔

چابک کی ضرب سے میں ایک دم بے حال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے میری طرف بڑھا اور میری گردن پر پاؤں رکھ کر بولا۔

"بتا کون آیا تھا تیرے پاس؟"

میں بالکل چُپ رہا۔

اس نے گردن پر سے پاؤں ہٹایا تو میں نے ایک دم اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی جس سے وہ تیورا کر چارپائی کی طرف گرا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر چارپائی اُس کے اُوپر گِرا دی۔ مگر وہ ایک دم سنبھل کر اُٹھا اور غرّاتا

ہوا میری طرف لپکا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ کر اُس نے مُجھے میمنے کی طرح زمین پر لِٹا دیا۔

وہ بڑا گرانڈیل جوان تھا اور میں کسی طرح بھی اُس کا مُقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار پھر اُس نے پوری قوّت سے میرا نرخرہ دبا کر چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے بولا:

"اِس بات کا پتہ تو میں خود کر لوں گا کہ تُجھے روٹی تیرے باپ نے کھلائی ہے۔ اپنے ابّا کا ایڈریس لکھوا مُجھے۔ جلدی بول اُلّو کے پٹھّے ورنہ میں تیری کھال تک کھینچ لوں گا۔"

میں اب کی بار پھر خاموش رہا۔

اب تو مُجھے سانس لینے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ گلا بُری طرح

دُکھنے لگا تھا۔

"اچھّا تُو اِس طرح نہیں مانے گا۔ ٹھہر میں تیرا اور بندوبست کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کمرے کی الماری کا تالا اپنی جیب سے چابیوں کا گُچھّا نکال کر کھولا اور وہاں سے اُس نے موچنے جیسا اوزار نکالا۔

ابھی وہ میری طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ پھر کھُلا اور ٹِکّا خان اندر داخل ہوا۔

"اوراجو بڑی دیر لگا دی تونے۔ باپ کا پتہ بھی نہ پوچھ سکا تو۔"

پھر اُس نے جو مُجھے پر نگاہ ڈالی تو حیران رہ گیا اور بولا:

"اوئے اِس چھلّاوے کو کِس نے کھولا ہے؟"

"یہ غلطی مُجھ سے ہی ہوئی ہے اُستاد۔ یہ نہیں بتاتا کہ اِس کے باپ کا پتہ کیا ہے۔ ذرا پکڑ کر رکھ اِسے میں اِس کے ناخن ہی کھینچ دوں گا۔"

اُس کی یہ بات سُنتے ہی ٹِکّا خان آگے بڑھا اور اُس نے میری دونوں بانہیں پکڑ کر کمر کے پیچھے لگا دیں۔ ٹِکّا خان میری بانہیں پکڑ کر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ راجو نے بڑی سختی سے میری ٹانگیں جکڑ لیں اور پھر اُس نے میرے جوتے اُتار کر اُس اوزار سے میرے انگوٹھے کے ناخن کو کُچھ اس زور سے پکڑ کر کھینچا کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ "بتائے گا اب بھی کہ نہیں بتائے گا؟" راجو بولا۔

"بتاتا ہوں میں ابھی بتاتا ہوں۔ خُدا کے لیے میرے ناخن نہ کھینچو۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

اور اپنے ابّا کا پورا پتہ میں نے اُنھیں بتا دیا۔

"دودھ تو دیتے ہو مگر مینگنیاں ڈال کر۔"

یہ کہہ کر راجو نے وہ اوزار جیب میں ڈالا اور اسی وقت میرا بتایا ہوا پتہ اس نے کاغذ پر لکھ لیا۔

اب کی بار میں نے کوئی جھوٹ نہ بولا تھا۔ وہ ناخن کھینچنے کی تکلیف ایسی ناقابلِ برداشت تھی کہ میں کِسی طرح بھی اپنے راز کی حفاظت نہ کر سکتا تھا۔

"چل بھئی راجو۔ اِس کے ابّا کو بھی ٹیلی فون کر دے کہ وہ تیس ہزار روپیہ دے کر اپنا لڑکا لے جائے ورنہ ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔" ٹِکّا خان بولا۔

"ابھی لے اُستاد۔ یہ رقم تو بالکل کھری سمجھ۔ بڑی موٹی اسامی ہے یہ۔"

راجو بولا۔

اور ایک بار پھر اسی کے ساتھ وہ مُجھے باندھنے کے لیے آگے بڑھا۔

"چھوڑ یار کمرہ بند کر دے۔ اِسے باندھنے کا کیا فائدہ۔ اِس کمرے سے یہ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔" ٹِکّا خان بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ دیکھ اوئے جُلفی قُلفی۔ اگر تُو نے کوئی گڑبڑ کی تو کھال کھینچ لوں گا تیری۔ بیٹھ جا اُدھر کونے میں جا کر۔" راجو نے دھکیل کر مُجھے کمرے کے کونے میں بِٹھا دیا۔

اور پھر وہ دونوں اُس کمرے کو باہر سے تالا لگا کر نیچے اُتر گئے۔

میں دیر تک اُس کمرے میں تنہا بیٹھا اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ آپ ہی آپ میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ وہ کتنے ظالم لوگ تھے۔ کسی

بے دردی سے چند پیسوں کے لیے دوسروں کے جگر گوشوں کو اِس طرح دھوکے سے پکڑ کر جنگلوں میں پہنچا دیتے تھے۔ اب وہ خُدا جانے میرے ابّا کو کیسے کیسے دھمکی آمیز پیغام بھیجیں گے۔ میری گُمشدگی کی خبر سُن کر تو اُن کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ کُل پچاس ہزار کے سرمائے سے وہ کام چلا رہے تھے۔ وہ بھی سارے کا سارا اُن کی اپنی پونجی نہیں تھا۔ پندرہ ہزار روپیہ اُنہوں نے بینک سے قرض لے رکھا تھا۔ ساری عمر کی کمائی اُنہوں نے اِس کاروبار میں جھونک دی تھی۔ میری امّی جان کا زیور بِکا۔ تارا پور والا مکان اُنہوں نے بیچا۔ تب جا کر وہ پینتیس ہزار روپیہ اِکٹھّا ہوا تھا اور اب وہ دِن رات کی محنت کے بعد اس قابل ہوئے تھے کہ سارے مغربی پاکستان میں اپنا مال پھیلا سکیں۔ اِس پچاس ہزار کے سرمائے میں سے اگر تیس ہزار روپیہ اُنہیں میری رہائی کے لیے اِن بد

معاشوں کو دینا پڑا تو وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جائیں گے اور میں جانتا تھا کہ وہ مُجھے ایسے لوگوں کے پنجۂ ستم سے چھڑانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد اُن کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو جاؤں۔ اُن کا ہاتھ بٹاؤں کیونکہ ملازموں سے اُنھیں کسی وفاداری کی اُمّید نہ تھی۔ کہتے تھے میرا اپنا بچّہ کام کرے گا تو پائی پائی پر نگاہ رکھے گا۔

مگر اب یہ راجو اور ٹِکّا خان ہمارا گھر تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ کسی نے کس طرح خُون پسینہ ایک کر کے روپیہ جمع کیا ہے۔ کتنی محنت سے کاروبار کو چلایا ہے۔ وہ ساری باتیں اِن لوگوں کے لیے بے معنی تھیں۔ وہ تو پستول کی گولی سے کام لینا جانتے تھے۔ لوٹ کھسوٹ اِن کا پیشہ تھا۔ اب تک خُدا معلوم کتنے گھر اِن لوگوں نے اُجاڑ

دیے تھے۔ اِن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلم کے ابّا سے بھی اِسی طرح روپیہ بٹورنا چاہتے ہیں۔ پہلے اُنہوں نے تتی صاحب کے داماد کی خُون پسینے کی کمائی ہڑپ کی۔ بڑے پُراسرار طریقے سے اُنہوں نے وہاں سے پچیس تیس ہزار روپیہ چُرایا۔ اب وہ مُجھے اور اسلم کو بھی لُوٹنا چاہتے تھے اور مُجھے اُمّید تھی کہ وہ میرے اور اسلم کے ابّا سے اینٹھنے کے بعد بھی ہمیں زندہ نہیں رہنے دیں گے کیونکہ ہم اُنہیں پکڑوا سکتے تھے۔

میں اُس بُڑھیا کے فریب میں نہ آتا اور حمید صاحب کے کہنے کے مطابق احتیاط سے کام لیتا تو شاید دو چار دِن شہر میں اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد میں ڈِکّا خان کا پیچھا کر کے اُس کا ٹھکانا معلوم کر لیتا کیونکہ وہ شہر میں آزاد پھرتا تھا۔ اگر وہ جوہڑ پر بار بار جا سکتا تھا تو شہر میں گھومنے سے اُسے کون روک سکتا تھا۔

میرا اپنا یہ اندازہ تھا کہ اِس شہر کی پولیس کو اُس کے کارناموں کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ وہ کسی اور ہی شہر سے آ کر وہاں ٹھہرا تھا۔ اُس کے گروہ میں عورتیں بھی شامل تھیں اور مرد بھی۔ وہ بُڑھیا اور اُس کی وہ بہُو اِسی سِلسلے کی ایک خوف ناک کڑی تھیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ اب مُجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں نے سوچا میں آج رات کے پہلے پہر اِس کھڑکی میں سے نیچے کود کر باہر نکل جاؤں گا۔ مگر وہ کھڑکی اتنی اونچی تھی زمین سے کہ میری ہڈّی پسلی ٹوٹ جانے کا قوی امکان تھا۔

کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر میں نے نیچے جھانکا تو معلوم ہوا کہ وہاں اینٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ اُس پر کودنا تو خود کُشی کرنے کے برابر تھا۔ کھڑکی میں کوئی ایسی کُنڈی نہ تھی جس کے ساتھ رسّی باندھی جا سکتی اور پھر رسّی بھی تو وہاں کوئی نہ تھی۔ جس ڈوری سے اُنھوں نے مُجھے باندھا تھا اُسے را جو لے

گیا تھا۔

میری سمجھ میں کُچھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔

میری چوٹوں سے درد کی ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔ ابّا نے یا میرے کسی اُستاد نے آج تک مُجھے ایک اُنگلی نہ لگائی تھی کیونکہ میں نے اُن کے حُکم سے کبھی سر تابی نہ کی تھی۔ سکول میں میں اچھّے اور ذہین طالب علموں میں شمار ہوتا تھا اور ابّا مُجھ سے اتنی محبّت رکھتے تھے کہ فرمائش میرے مُنہ میں ہوتی تھی مگر وہ پوری پہلے کر دیتے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ میں نے سائیکل مانگی تو وہ ابّا نے لے دی۔ میں نے کہا اسّی روپے کا بلّا مُجھے لے دیں تو اُنھوں نے فوراً منگوا دیا۔ میں نے کہا فلاں مصنّف کی ساری کتابیں مُجھے لے دیں تو وہ اسی وقت میرے ساتھ گئے اور مُجھے ڈھیر ساری کہانیوں کی کتابیں اُنھوں نے خرید کر دے دیں۔ مُجھ سے کوئی

نقصان بھی ہو جاتا تو وہ کُچھ نہ کہتے۔ امّی تو کبھی کبھی مُجھے ڈانٹ بھی دیتی تھیں مگر ابّا نے ہمیشہ شفقت بھری مُسکراہٹ سے مُجھے دیکھا۔

مگر اِن غُنڈوں کے ہتھّے چڑھ کر میں نے جو تکلیف اٹھائی تھی اِسے میں بیان ہی نہیں کر سکتا اور میرا قصور کیا تھا۔ صرف یہ کہ میں نے جوہڑ میں سے پستول نکال لیا تھا اور اِن بدمعاشوں کے چہرے اچھّی طرح پہچانتا تھا اور تھانے کے اندر میں نے چیمہ صاحب کے کہنے کے مطابق اُن تمام مُجرموں میں ٹِکّا خان اور راجو کو شناخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں یہ سوچتا تھا کہ اِن لوگوں کو کس نے بتایا کہ تھانے کے اندر کیا ہوا ہے۔ اُس بُڑھیا، آفت کی پُڑیا کو کس نے بتایا تھا کہ میں ہی ذوالفقار ہوں۔ اُسے میرے چہرے کی پہچان کسی طرح ہوئی۔ میں نے تو اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ ایسا گورکھ دھندا تھا جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔

دوپہر ہوئی۔ پھر سائے ڈھلنے لگے۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا مگر پانی میری قسمت میں ہی نہ رہا تھا۔ کسی نے بھی اُوپر آ کر نہ دیکھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ وہ لڑکا خُدا جانے کون تھا۔ وہ بھی پھر اُوپر نہیں آیا تھا۔ اس نے مُجھے روٹی کیوں کھلائی تھی۔ اگر اُسے اسلم نے بھیجا تھا تو اِس کا مطلب یہ تھا کہ اسلم پر اتنی زیادہ پابندیاں عاید نہیں کی گئی تھیں۔ وہ آزاد تھا۔

مگر وہ آزاد تھا تو میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ ٹِکّا خان سے خوف زدہ ہونے کی وجہ سے کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہو۔ اُس نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ رات کو آئیں گے۔

اِس کا مطلب یہ تھا کہ مُجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر وہ مُجھے آزاد کروا سکتا خود کیوں نہیں بھاگ جاتا۔ وہ اپنی جان کیوں نہیں

چھڑا لیتا۔ مُجھے تو کوئی اُمّید نہیں تھی کہ اسلم میری کوئی مدد کر سکے گا۔ میں اسی مُصیبت میں گرفتار تھا جس کا کوئی حل مُجھے نظر نہ آتا تھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ شام کے دُھندلکوں نے مُجھے احساس دلایا کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ چارپائی جو وہاں پڑی تھی اس کا بان ٹوٹا ہوا تھا اور پائنتی کی رسّی غائب تھی۔ میں نے سوچا میں آج رات ہر قیمت پر وہاں سے نکل جاؤں گا خواہ میری ٹانگ ہی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔

ایک بار پھر میں نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا طاری ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے ہٹ کر میں چارپائی کی طرف بڑھا اور اُس میں سے رسّیاں نکالنے لگا۔ میں نے سوچا کھڑکی میں سے کُودنے کی بجائے اگر میں مضبُوط رسّا بنا کر اُس سے لٹک کر نیچے اُتروں تو زیادہ بہتر ہے۔

ایک ایک کر کے میں نے آدھی سے زیادہ رسّیاں کھینچ لیں اور اُن سے ایک مضبُوط رسّا بنانے لگا۔ دیر تک میں اِس کام میں مشغول رہا۔ رسّیاں بڑی ہی پرانی اور گھِسی ہوئی تھیں۔ کئی ایک تو اُنگلیوں میں ہی ٹوٹ جاتی تھیں۔ پھر بھی میں نے ہمّت نہ ہاری اور رسّا بنانے میں مصروف رہا۔

وہ اتنے سنگ دِل لوگ تھے کہ اُنھیں یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ مُجھے بھی بھوک پیاس لگتی ہے۔ میں اب پھر بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں کھا سکتا۔ مُجھ پر عجیب سی بے بسی کا عالم طاری تھا۔ اسلم اب تک اِدھر نہ آیا تھا۔ نہ ہی وہ لڑکا مُجھے کہیں نظر آتا تھا۔ مُجھے تو یقین تھا کہ اسلم اور اُس لڑکے کو ان لوگوں نے مُجھے صُبح کھانا دینے کی وجہ سے خوب پیٹا ہو گا۔ وہ ایسی گُستاخی کسی طرح بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ اسلم کا تو اُنھوں نے خُدا جانے کیا حال کر رکھا ہو گا۔ وہ لڑکا

مُجھے انہی کا بھائی بند معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ملیشیے کی وردی پہن رکھی تھی اور اُس کی بات چیت سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا نہیں ہے۔

مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ اگر میرے لیے کھانا لا سکتا تھا اور اسلم کے ساتھ آزادی سے بات کر سکتا تھا تو پھر اب اُنہیں کس نے پکڑ رکھا تھا اور اسلم کو جب اتنا سارا موقع حاصل تھا تو وہ اب تک وہاں سے بھاگا کیوں نہیں۔

میں نے چھوٹی چھوٹی رسّیوں کو اچھّی طرح گوندھ کر بیس فٹ لمبا ایک مضبُوط رسّا بنا لیا تو میں نے سوچا کہ اب میں اِسے کس شے سے باندھوں کیونکہ کھڑکی میں نہ کوئی سلاخ تھی نہ کوئی اور ہی ایسی جگہ تھی جس سے میں اِسے باندھ سکتا۔ کئی تدبیریں ذہن میں اُبھریں مگر اِن میں سے کوئی بھی قابلِ عمل نہیں تھی۔ آخر میں نے اُس چارپائی کو کھڑکی کے سامنے رکھا اور

اُس کے ایک ڈنڈے سے میں نے رسّے کا ایک سِرا کس کر باندھ دیا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے چارپائی کے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

کُچھ دیر تک تو میں وہاں دم سادھ کر کھڑا رہا۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ کہیں کوئی آدمی اُوپر تو نہیں آ رہا ہے۔ مگر نہیں۔ مکان پر مکمل خاموشی طاری تھی۔

آخر میں اللہ کا نام لے کر کھڑکی میں سے باہر لٹک گیا۔ رسّے کا دوسرا سِرا میں نے اپنی کمر سے باندر رکھا تھا۔

چارپائی میرے بوجھ سے کڑکڑائی۔ میں تو سمجھا کہ ٹوٹ ہی جائے گی کیونکہ جب میرا پورا وزن رسّے پر آیا تو چارپائی ایک جھٹکے کے ساتھ دیوار سے ٹکرائی۔ میرا دِل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ اگر مُجھے نیچے اُترتے ہوئے اَن لوگوں

میں سے کسی نے دیکھ لیا تو وہ جان سے مار دیں گے۔ پھر بھی میں سنبھل سنبھل کر نیچے اُترتا رہا۔ میرا ایک پاؤں اُن اینٹوں کے ڈھیر پر لگا ہی تھا کہ رسّہ ٹوٹ گیا اور میں پیٹھ کے بل دھڑام سے نیچے گِرا۔ مُجھے کُچھ چوٹیں بھی آئیں مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ مُجھے تو اپنی جان کی فکر لگی تھی۔ مکان کی اُس دیوار میں نچلی منزل پر کوئی کھڑکی کھُلی نہیں تھی۔ تین کھڑکیاں تھیں جن میں سلاخیں لگی تھی اور تینوں کی تینوں بند تھیں۔ رسّا اُوپر کی گرہ کے قریب سے ٹوٹا تھا اور اب وہ سارے کا سارا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُسے تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑلیا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا طاری تھا۔ وہ مکان اِس جنگل میں بالکل تنہا تھا۔ کافی فاصلہ پر کسی آبادی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اینٹوں کے اِس ڈھیر سے اُتر کہ باری باری میں نے وہ تینوں کھڑکیاں دیکھیں اور پھر آگے

بڑھا۔ صدر دروازہ اندر سے بند تھا اور اُس دیواریں آٹھ آٹھ فٹ اونچی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اِس وقت یہ لوگ سو چکے ہیں۔ اندر سے کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ مُجھے کسی نہ کسی طرح اندر جا کر معلوم کرنا چاہیے کہ اسلم کہاں ہے۔ اگر مُمکن ہو سکے تو مُجھے اُس کو بھی اِن لوگوں کی قید سے چھڑانا چاہیے۔

یہ سوچ کر میں نے رسّا اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور بائیں طرف دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے ایک شیشم کے درخت پر چڑھنے لگا۔ وہ درخت اِتنا اونچا تھا کہ اُس کی ٹہنیاں اِس مکان کے اندر سایہ کیے رہتی تھیں۔ جب میں اُوپر چڑھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مکان کا صحن بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی شے بھی نظر نہ آتی تھی۔

جس چوبارے میں مَیں قید تھا اُسی کے دائیں ہاتھ پہلی منزل میں تین کمرے تھے۔ وہ سب کے سب اندر سے بند معلوم ہوتے تھے۔ صرف ایک کمرے میں بلب روشن تھا۔ باقی دونوں کمرے تاریک تھے۔

میں نے رسّہ ایک موٹی شاخ سے باندھا اور اُس گِرہ کو اچھّی طرح دیکھ بھال کر میں رسّے کی مدد سے نیچے صحن میں اُتر گیا اور اپنے بوٹ اُتار کر میں نے اُن کے دونوں تسمے پتلون کی پیٹی سے باندھ لیے اور دبے پاؤں پہلے کمرے کے دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔

معلوم یہ ہوتا تھا کہ چوبارے کو جو سیڑھیاں جاتی ہیں وہ اِسی کمرے سے نکلتی ہیں کیونکہ وہ تینوں کمرے ایک ہی قطار میں تھے اور وہاں پر کوئی سیڑھی دِکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک ایک کر کے میں نے تینوں دروازے دیکھ لیے۔ وہ سب کے سب اندر سے بند تھے۔

جس کمرے کے سامنے میں کھڑا تھا اُس کا بلب تھوڑی دیر کے بعد بُجھ گیا۔

اب میری سمجھ میں کُچھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ دروازے میں ایسی کوئی درز نہ تھی جس میں سے میں اندر جھانک کر دیکھ سکتا کہ وہاں کون بیٹھا ہے۔

پندرہ بیس منٹ اِسی طرح گزر گئے۔

اچانک اُس کمرے کا بلب پھر روشن ہوا اور کسی نے دروازہ کھولنے کے لیے چٹخنی پر ہاتھ ڈالا۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا غُسل خانے کی دیوار کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔

غُسل خانے کے ساتھ ہی پاخانہ تھا۔

کوئی آدمی کمبل اوڑھ کر کمرے سے باہر نکلا اور پاخانہ میں جا گھُسا۔

کوئی دس منٹ بعد وہ وہاں سے نکلا اور غُسل خانے میں داخل ہو گیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ اُس غُسل خانے کا دروازہ باہر کی طرف کھُلتا تھا اور اُس کا ایک ہی پٹ تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر وہ دروازہ بند کر کے باہر سے کُنڈی چڑھا دی۔

اُس آدمی نے ایک دم بڑے زور سے دروازے کو ٹھوکر ماری۔ اور کڑک کر بولا:

"کون ہے؟ کِس نے دروازہ بند کیا ہے؟"

وہ ٹِکّا خان کی آواز تھی۔

میں بالکل خاموش رہا۔

"دروازہ کھولو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔"

میں پھر بھی خاموش رہا۔

وہ دروازہ اگرچہ کافی مضبُوط تھا پھر بھی میں ڈرا کہ وہ کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ اِس لیے میں بھاگ کر اُس کمرے میں جا گھُسا جہاں سے وہ نکلا تھا۔ میری بڑی زبردست حماقت تھی میں اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ بغیر سوچے سمجھے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو بستر بچھے ہوئے تھے۔ ایک پر لحاف کھُلا پڑا تھا اور اسی بستر پر سے اُٹھ کر ٹِکّا خان رفع حاجت کے لیے باہر نکلا تھا۔ دوسرا بستر بالکل خالی تھا اور اُس پر ایک لحاف تہہ کیا ہوا پائنتی پر رکھا تھا۔

میں نے جب دیکھا کہ کمرے میں اور کوئی آدمی موجود نہیں ہے تو اللہ کا شکر

ادا کیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھالی۔

غُسل خانے کے اندر کھڑا ٹِکّا خان بڑی بڑی وزنی گالیاں لڑھکا رہا تھا اور وحشی درندے کی طرح دروازہ کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر دروازہ ابھی تک اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے یونہی تکیے کی طرف ہاتھ رکھا تو چادر کے نیچے مُجھے کسی سخت شے کا احساس ہوا۔ میں نے چادر اُٹھائی تو وہاں پستول پڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس کو دستے سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ کافی وزنی تھا جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اُس میں گولیاں بھری ہوئی ہیں۔

پستول ہاتھ میں پکڑ کر میں نے اُس کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ وہاں دو دروازے ہیں۔ ایک دائیں ہاتھ کی دیوار میں اور دوسرا

بائیں طرف کی دیوار میں۔

دونوں کی کنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک کنڈی کھولی تو سامنے مُجھے وہ سیڑھیاں نظر آئیں جو چوبارے کی طرف جاتی تھیں۔ وہاں سے ہٹ کہ میں نے اسی کمرے کے دوسرے دروازے کی کُنڈی کھولی مگر وہ دوسری طرف سے بند تھا۔

وہاں میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دستک دی۔ مگر کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب میں نے دبی آواز سے اسلم کو پکارا۔ مگر پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

"اسلم!"

اب کی بار میں نے دروازے پر مُنہ رکھ کر آواز دی۔

"کون ہے؟" تھوڑی دیر بعد مجُھے کسی لڑکی کی آواز سُنائی دی۔

"دروازہ کھولو۔ میں اسلم کا دوست ذوالفقار ہوں۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

باہر ٹِکّا خان برابر اُس دروازے کو توڑ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس قدر جوش میں تھا جیسے کوئی اندھا بھینسا دیوار سے ٹکرا رہا ہے۔

اس لڑکی نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا۔ بلب کی روشنی میں اب میرے سامنے ایک بارہ سال کی خوب صورت سی لڑکی کھڑی تھی جس نے کسی سکول کی وردی پہن رکھی تھی۔ اُس کی قمیص بھی سفید تھی اور شلوار بھی۔ اُس نے سفید کینوس کے جوتے پہن رکھے تھے۔ سر پر سُرخ

ٹائی تھی اور سُرخ ہی رنگ کی اُس نے پیٹی باندھ رکھی تھی۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں۔ اُس کے گالوں پر طمانچوں کے نشان صاف دکھائی دیتے تھے۔

"اسلم کہاں ہے؟"

"مُجھے پتہ نہیں اسلم کون ہے مگر دو لڑکے دوسرے کمرے میں بند ہیں۔" وہ گلوگیر آواز سے بولی۔

"تُم کون ہو؟"

"میرا نام سلمیٰ ہے اور مُجھے آج صُبح ایک آدمی یہاں لایا تھا۔"

"کہاں سے لایا تھا وہ تمہیں؟"

"میری استانی نجمہ کی ایک سہیلی ہے۔ وہ مجھے صُبح اسکول کے راستے میں مل گئی اور رکشے میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ وہاں اُس نے مجھے دودھ پلایا جس سے میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں یہاں پڑی ہوئی تھی۔"

"اس عورت کا مکان کہاں ہے؟"

"مُسلم کالونی میں۔ وہاں بہار شاہ کا مکان ہے جس میں وہ عورت رہتی ہے۔" وہ لڑکی بولی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہار شاہ کا مکان ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُس عورت نے جس مکان کے سامنے وہ رکشا ٹھہرایا اس کے باہر جو تختی لٹکی ہے اُس پر بہار شاہ کا نام لکھا ہوا ہے۔" وہ لڑکی بولی۔

"تمہیں اِنھوں نے مارا بھی ہے؟"

"ہاں۔ میں جب یہاں پہنچ کر ہوش آنے پر رونے لگی تو اِس کمرے میں جو آدمی ہے نا اُس نے مُجھے طمانچے مارے تھے۔"

"تُم کِس سکول میں پڑھتی ہو؟"

"جوزف کانونٹ سکول میں۔" وہ بولی۔

"تمہارے ابّا کیا کام کرتے ہیں؟"

"وہ انکم ٹیکس آفیسر ہیں۔ اُن کا نام نوازش علی ہے۔ اور ہم دِلاور روڈ پر رہتے ہیں، بنگلہ نمبر ۱۸ میں۔" وہ بولی۔

لڑکی بڑی ذہن اور سمجھدار دِکھائی دیتی تھی وہ۔

مگر وہ عورت جو بہار شاہ کے مکان میں رہتی تھی، بڑی آفت کی پُڑیا

عورت تھی اور وہ لڑکی اُس روز اُس بڑھیا کی بہُو کے ظُلم کا شکار ہوئی تھی۔

غُسل خانے میں بند ڑِکّا خان وہاں سے نکلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

"یہاں اور کوئی کون رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک اور آدمی ہے یہاں۔ اُس کا نام راجو ہے۔ وہ اِس کمرے میں جو آدمی رہتا ہے اُسے اُستاد اُستاد کہہ کر پُکارتا تھا۔ وہ آج دوپہر کے وقت یہاں سے چلا گیا ہے۔ اُس نے اور ڑِکّا خان نے آج میرے یہاں آنے کے بعد اِن دونوں لڑکوں کو خوب مارا تھا اور پھر اُنہیں مُنہ پر رومال باندھ کہ رسّیوں میں جکڑ کر دوسرے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کہتے تھے تُم نے اُسے روٹی کیوں دی۔ پتہ نہیں وہ کِسے روٹی دے آئے تھے۔" وہ بولی۔

"چلو ہم اُنہیں چھڑاتے ہیں اُس کمرے سے؟" میں نے کہا۔

"مگر اِس کمرے میں تالا لگا ہے؟" وہ بولی۔

"اچھّا دِکھاؤ تو ذرا۔"

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ دیکھا تو وہاں کافی مضبُوط تالا لگا تھا۔

"یہ باہر غُسل خانے کا دروازہ کون توڑ رہا ہے؟" اُس لڑکی نے گھبرا کر کہا۔

"وہاں راجو کا اُستاد ڈِکّا خان بند ہے۔ لاؤ ہم تالا کھولتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اور کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔

ڈِکّا خان کے کمرے کی الماری میں مُجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک لوہے

کی موٹی سُلاخ مِل گئی۔ میں نے وہ سُلاخ لی اور سلمیٰ کے کمرے میں جا کر تالے میں وہ سُلاخ پھنسا کر پوری قوّت سے جھٹکا جو دیا تو وہ تالا کھُل گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جب کُنڈی کھول کر بتّی جلائی تو اسلم اور اُس کے ساتھی کو میں نے ایک دوسرے کے ساتھ یوں بندھے دیکھا جیسے لکڑیوں کا گٹھّا۔ سر سے پاؤں تک اُن کے جسم پر رسّیاں بندھی تھیں۔ پاؤں سے پاؤں، پیٹ سے پر پیٹ اور سینہ سے سینہ ملا کر اُنہیں ہوں جکڑا گیا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں۔ ایک کا سر دوسرے کے کندھے پر رکھا تھا اور اُن کے مُنہ پر کس کر رومال بندھے ہوئے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر بڑی مُشکلوں سے اُن کے وہ جکڑ بند کھولے۔ اور جب میں نے اُن کے مُنہ سے رومال اُتارے تو اُن کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہہ نِکلے۔

اسلم بڑی مُشکل سے اُٹھا اور میرے گلے لگ کر بے تحاشا رونے لگا۔

"حوصلہ رکھو اسلم! اب کوئی فکر نہیں ہے۔ میں تمھیں یہاں سے چھڑا لوں گا۔" میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ میرے دوست! اُنھوں نے مُجھے بڑی تکلیف دی ہیں اور یہ سب کُچھ میری اپنی غَلطی سے ہوا ہے۔" اسلم نے کہا۔

"کوئی بات نہیں غَلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ چلو اب باہر نکلو۔"

یہ کہہ کر میں اُنہیں کمرے سے باہر لایا۔ اسلم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ دوسرے لڑکے کا نام بشیر تھا۔

میں نے سوچا اب باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بہتر ہے ہم فوراً وہاں سے نکل چلیں کیونکہ ٹِکّا خان غُسل خانے میں سے نکلنے کی سر توڑ

کوشش کر رہا تھا۔

"اور تو کوئی آدمی قید نہیں ہے یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے اور کوئی آدمی یہاں موجود نہیں ہے۔" اسلم بولا۔

"راجو نے میری بالیاں اُتار لی تھیں بھائی جان۔" سلمیٰ نے مجھے بتایا۔

"کہاں رکھی تھیں اُس نے وہ بالیاں؟" "اپنی جیب میں۔"

"اب وہ یہاں ہوتا تو ایک بات تھی۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اب بس نِکل چلو یہاں سے،۔"

"راجو تو تمہارے، میرے اور سلمیٰ کے ابّا سے تیس تیس ہزار روپیہ وصول کرنے گیا ہوا ہے۔" اسلم نے کہا۔

"اچھّا کمال ہے۔ اُس کے سر میں تیس تیس ہزار جوتے لگیں گے اب۔"

یہ کہہ کر میں اُن تینوں کو ساتھ لے کر ٹِکّا خان کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں ایک آہنی سیف رکھا تھا جسے ہم کسی طرح بھی نہ کھول سکتے تھے۔ ٹِکّا خان کا کوٹ وہاں لٹک رہا تھا۔ میں نے اُس کی جیبوں کو ٹٹولا تو مُجھے وہاں سے چھ سو روپے کے نوٹ اور اُس بڑے سے آہنی سیف کی چابیاں ملیں۔

"اس سیف کی چابیاں ہیں یہ۔" میں نے کہا۔

"چھوڑو یار ابھی اِسے مت کھولو۔ یہاں سے بھاگنے کی سوچو۔" اسلم بولا۔

"اِس میں بڑی دولت جمع ہے یار! اِسے ضرور کھولنا چاہیئے۔" بشیر بولا۔

"نہیں۔ اِسے پولیس ہی کھولے گی۔ چابیاں ہم ساتھ لے چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے اُن سب کو اُس کمرے سے باہر نکالا۔ ڈِکّا خان ہماری آوازیں سُن کر ہمیں زبردست گالیاں دے رہا تھا۔

میں نے کہا :

"اُلّو کے چرخے۔ تو چُپ بھی ہو گا کہ نہیں! ورنہ میں تُجھے گولی مار دوں گا۔"

میری اِس بات پر اُس نے مُجھے بڑی وزنی گالی دی۔

"بکنے دو یار اِسے۔ اگر پستول ہوتا تو میں اِسے ابھی گولی مار دیتا۔" اسلم بولا۔

"پستول تو میرے پاس ہے یہ دیکھو۔ مگر ابھی ہم اِسے کُچھ نہیں کہیں گے۔"

"ارے تو پھر ڈرتے کیوں ہو۔ اِدھر آؤ۔ میری ایک بات سُنو۔" یہ کہہ کر اسلم ہمیں ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا:

"اِسے اگر تُم نے یہاں چھوڑ دیا تو یہ پھر بھاگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے پولیس کے آنے سے پہلے ہی اِسے راجو یہاں سے نکال کر لے جائے۔"

"پھر کیا کریں ہم؟" میں نے پوچھا۔

"میں پستول پکڑ کر کھڑا ہوتا ہوں۔ تُم کنڈی کھول کر اِسے باہر نکالو اور اِسے رسّے سے جکڑ لو۔ اگر اِس نے کوئی گڑبڑ کی تو میں گولی مار کر اِسے مار دوں گا۔ رسّیوں میں جکڑ کر ہم اِسے شہر لے جائیں گے۔" اسلم بولا۔

"تجویز تو ٹھیک ہے یار مگر وہ بڑا تنگڑا آدمی ہے۔ اگر وہ پستول سے نہ ڈرا تو پھر ہماری خیر نہ ہوگی۔"

"تُم ڈرو مت یار! ہم اِسے اِسی رسّے سے باندھ سکتے ہیں۔" اُس نے صحن میں درخت کے ساتھ لٹکتے ہوئے رسّے کو پکڑ کر کہا۔

"اچھّا تو پھر میں یہ رسّہ اُتارتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور اُسی وقت رسّے کے ساتھ لٹک کر میں درخت پر چڑھا اور اُس کی گِرہ کھول کر دوسری طرف سے باہر اُتر گیا۔

اسلم نے صحن کا دروازہ کھول کر مُجھے اندر داخل کیا۔

"چل سلمیٰ غُسل خانے کی کُنڈی کھول کر تو کھُلے دروازے میں سے باہر بھاگ جا۔" اسلم نے کہا۔

اور پستول ہاتھ میں لے کر اُس نے اُس کی گولیاں دیکھیں۔ پھر بولا:

"بشیر تُم رسّے کا ایک سِرا پکڑو۔ زلفی تُم دوسرا سِرا پکڑلو اور غُسل خانے کے سامنے ذرا فاصلے پہ ٹھہر جاؤ۔ میں گولی چلا کر پہلے ٹِکّا خان کو خبر دار کرتا ہوں کہ اگر اُس نے کوئی حرکت کی تو ہم اُسے گولی مار دیں گے۔" اسلم بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"

یہ ساری باتیں ہم نے غُسل خانے سے دور ہٹ کہ کُچھ اس طرح سرگوشی کے لہجے میں ایک دوسرے سے کہیں کہ ٹِکّا خان کے پلّے کُچھ بھی نہ پڑ سکا ہو گا۔ وہ اگرچہ اِس عرصہ میں کان لگا کر ہماری باتیں سُنتا رہا تھا اور اُس نے دروازے کو پیٹنا بند کر دیا تھا۔ پھر بھی مُجھے یقین ہے کہ وہ ہماری کوئی بات نہ سُن سکا ہو گا۔

"چل سلمیٰ تو کنڈی کھول دے۔" میں نے کہا۔

اور اِس رسّے کو میں اور بشیر دونوں طرف سے پکڑ کر غُسل خانے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

سلمیٰ ابھی تک اسلم کے پاس کھڑی تھی۔

پستول اسلم کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ غُسل خانے کے سامنے آٹھ فٹ کے فاصلے پر جم کر کھڑا تھا۔ اُس نے بُلند آواز سے کہا: "ٹِکّا خان۔ تُو ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ پستول بھرا ہوا میرے ہاتھ میں ہے اور میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ اگر تُو اپنی زندگی چاہتا ہے تو خود کو میرے حوالے کر دے ورنہ گولی تیرے دماغ سے پار ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اُس نے غُسل خانے کے اُوپر سے گولی چلا دی۔

رات کے سنّاٹے کو درہم برہم کرتی ہوئی وہ گولی غُسل خانے کی دیوار سے ٹکرائی۔

"ہم کُنڈی کھول رہے ہیں ٹِڈّا خان! اب باہر نکل آ۔" کھُلے دروازے میں سے کمرے کے بلب کی روشنی صحن میں آ رہی تھی۔

سلمیٰ نے آگے بڑھ کر کُنڈی کھولی اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

"باہر نکل آ ٹِڈّا خان ورنہ اچھّا نہ ہوگا۔" اسلم نے بڑے استقلال کے ساتھ کہا۔

اُس کی یہ آواز سُنتے ہی غُسل خانے کا دروازہ کھُلا اور طوفان کی طرح ٹِڈّا خان گرجتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا باہر نکلا۔

میں رسّہ اُس کے گلے میں لپیٹنے کے لیے اپنی جگہ سے آگے بڑھا تو وہ

تیزی سے میری طرف لپکا۔ اسلم نے عین اُس وقت پستول داغ دیا۔ ڈز کی آواز پیدا ہوئی اور ٹِکّا خان لڑکھڑا کر دائیں طرف کو جھُکا۔ گولی اُس کے شانے پہ لگی تھی جس کی وجہ سے اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ شل ہو کر نیچے گر گیا۔ بس اِتنی سی مُہلت ہمارے لیے کافی تھی۔ ہم نے ایک دم اُسے رسّے میں جکڑ لیا اور اُس کی دونوں بانہیں اچھّی طرح کس کر باندھ لیں۔ اُس کے زخم سے دھڑا دھڑ خُون بہہ رہا تھا اور گولی اُس کے کندھے میں کہیں دھنس چکی تھی۔ ہم نے اس کے کندھے پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گولی کندھے اور ہنسلی کی ہڈّی کے نیچے سے گُزر کہ پار ہو چکی تھی۔

لحاف پھاڑ کر اسلم نے اُس کے زخم میں روئی یوں ٹھونس دی جیسے وہ انسان نہیں کوئی حیوان تھا۔ روئی زخم میں ٹھونس دینے سے اُس کا خُون بند ہو گیا۔

"چل بھئی ٹِکّا خان پیارے۔ اب ہمارے ساتھ ہی چل۔ اُٹھ وحشی درندے تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔" میں نے اُسے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی مُشکلوں سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو اسلم نے اپنے پستول کی نالی اُس کے سینے سے لگا دی اور بولا:

"اگر تُو نے کوئی گڑبڑ کی تو مُجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ ہم تُجھے تھانے لے جائیں گے۔"

اِس پر بشیر بولا:

"یار یہاں ایک سائیکل ہے۔ ہم اُستاد کو اُس پر بِٹھا لیتے ہیں۔ شہر یہاں سے سات میل دور ہے۔"

"تو لا پھر سائیکل نکال باہر۔" میں نے کہا۔

میری یہ بات سن کر بشیر کمرے میں گیا اور سائیکل نکال کر باہر لے آیا۔ ہم نے ٹِکّا خان کو سائیکل کے کیریر پہ بٹھایا اور یہ قافلہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل دیا۔

راستے میں ٹِکّا خان کُچھ نہ بولا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ وہ شاید اپنی سُدھ بُدھ ہی کھو بیٹھا تھا۔ مگر نہیں وہ شاید اپنی بے بسی پر کُچھ اِس طرح تِلملا رہا تھا کہ اُس کے مُنہ سے بات ہی نہ نکلتی تھی۔ ہم نے اُسے دونوں طرف سے تھام رکھا تھا اور اسلم سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور سلمیٰ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

راستہ تاریک اور ویران تھا پھر بھی ہم کچّی پگڈنڈیاں عبُور کر کے آہستہ آہستہ

پکّی سڑک پر جا چڑھے۔ خُوف سے ہمارے دِل دھک دھک کر رہے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ اگر کہیں راجو آگیا تو کیا ہو گا۔ وہ تو ہم سب کو جان سے ہی مار ڈالے گا۔

"یار زُلفی ہینڈل تو پکڑ لے۔ اگر کہیں راجو سے سامنا ہو گیا۔ تو میں اُس سے نپٹ تو سکوں گا۔ پستول تو صرف میں ہی چلانا جانتا ہوں۔" اسلم بولا۔

"ہاں یار! اِس بات کا تو بڑا خیال رکھنا چاہیے۔"

وہ سات میل کا راستہ ہم نے تین گھنٹے میں طے کیا اور رہا نپتے کانپتے ہوئے بڑی مُشکلوں سے ہم شہر پُہنچے۔ اور تھانہ جنوبی کے دروازے پر جا ٹھہرے۔

دروازے پر کھڑے سپاہی نے ہمیں دیکھا تو کڑک کر بولا:

"اوئے کون ہو تُم اور یہ کون ہے ہائیں؟"

"جی پہلے ہمیں آپ تھانیدار صاحب سے ملا دیں۔" اسلم نے کہا۔

"اوئے رات کا ایک بجا ہے۔ تُم یہ زخمی کہاں سے لائے ہو؟" اُس سپاہی نے ٹِکّا خان کے خُون میں لت پت کندھے کو دیکھ کر کہا۔ "ہمیں آپ تھانے دار صاحب کے پاس لے چلیں۔"

"چلو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے سائیکل کو سہارا دیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر تھانے کے اندر چلا گیا۔

سب انسپکٹر صاحب جن کا نام اظہر علی تھا ابھی ابھی گشت سے واپس آئے تھے اور اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

سپاہی نے ہمیں باہر ٹھہرایا اور اندر جا کر اِطّلاع دی کہ کُچھ لڑکے آئے ہیں۔

سلمیٰ تو بے چاری بہت ہی سہمی ہوئی تھی۔ یہ ساری باتیں اُس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھیں۔

اظہر علی صاحب فوراً ہی باہر آئے اور بولے :

"کیوں بھئی بچّو! یہ کیا قصّہ ہے۔ یہ کون آدمی ہے جسے تُم نے رسّیوں میں جکڑ رکھا ہے۔"

"جی میرا نام محمد اسلم ہے۔ یہ میرا دوست ہے ذوالفقار ہے۔ ہم گورنمنٹ اسکول کے طالبِ علم ہیں اور یہ ہے وہ آدمی جس نے ہمیں اغوا کیا تھا۔ اِس لڑکی کا نام سلمیٰ ہے۔"

"تُم اسلم ہو اور یہ زُلفی ہے۔ اچھّا کمال ہے بھئی۔ شیر خان! اِس آدمی کو ابھی حراست میں لے لو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"جی اِس کا نام ٹِکّا خان ہے اور اِس کے ساتھی کا نام راجو ہے۔"

"راجو! ارے یہ نام تو میں نے پہلے بھی کہیں سُن رکھا ہے۔" اظہر صاحب بولے۔

شیر خان نے دو سپاہیوں کو بُلایا۔ اُنھوں نے فوراً ٹِکّا خان کو ہتھکڑی لگا دی۔ اور لے جا کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا۔

جب ہم اظہر صاحب کے سامنے بیٹھ کر چائے پی چُکے تو میں نے وہ سب کُچھ اُنھیں بتا دیا جو مُجھ پر بیت چُکا تھا۔ اِس پر وہ بولے:

"یہ لڑکا کون ہے؟" اُن کا اشارہ بشیر کی طرف تھا۔

"جی میرا نام بشیر ہے۔ میں مِس فوزیہ کا ملازم تھا۔ وہ مُسلم کالونی میں رہتی ہیں۔ اُن کی ایک ماں ہے۔ وہ بھی اُن کے ساتھ رہتی ہے۔ پندرہ دِن پہلے ٹِکّا خان کراچی سے آیا تو میں فوزیہ کا بھائی راجو اُسے اپنے ساتھ لے کر ہمارے پاس جا پہنچا۔ کُچھ دنوں بعد راجو نے مُجھے کہا کہ میں گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تقی صاحب کے کُتّے جیپسی کو ہلاک کر دوں اور کہا کہ وہ اِس کام کے لیے مُجھے دو سو روپے انعام دیں گے۔ اس اسکول میں میرا کوئی واقف نہ تھا جس کی مدد سے میں یہ کام کر سکتا۔ ایک دِن رات کو سیروز سنیما میں میری مُلاقات اسلم سے ہوئی۔ اُسے میں نے تین چار دِن اپنی جیب سے سینما دِکھایا کیونکہ مُجھے راجو بڑے پیسے دیا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسلم سے کہا کہ وہ جیپسی کو ہلاک کرنے میں میری مدد کرے۔ اِس نے پوچھا کہ میں جیپسی کو کیوں مارنا چاہتا ہوں تو میں نے کہا کہ اِس کُتّے نے میرے

بھائی کو اتنا زخمی کر دیا تھا کہ وہ بے چارا ہسپتال جا کر مر گیا۔ میری یہ بات سُن کر اسلم نے کہا کہ اِس کُتّے سے تو میں بھی بہت تنگ ہوں۔ ہاسٹل کے سب لڑکے تنگ ہیں کیونکہ رات کو جب کوئی لڑکا دیر سے ہاسٹل پہنچتا ہے تو وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے اور ترمزی صاحب اُس لڑکے کو پکڑ کر خوب سزا دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس پستول موجود ہے۔ اس پر اسلم بولا کہ میں بھی پستول چلانا جانتا ہوں۔ تُم پستول مُجھے دے دو۔ میں اُسے خود گولی ماروں گا۔ دو دفعہ اُس جیپی نے میرے بھی کپڑے بھاڑ دیے تھے۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد ہم رات کو بارہ بجے سینما دیکھ کر نکلے اور ہاسٹل میں جا گھُسے۔ جیپی نے حسبِ عادت ہم پر غرّا کر حملہ کر دیا۔ میں نے گولی داغ دی جو اُس کے سینے میں لگی۔

اِس پر اسلم نے دوسری گولی چلانے کے شوق میں پستول مُجھ سے چھین لیا۔ عین اُس وقت تقی صاحب کا نوکر باہر نکلا جب کہ اسلم دوسری گولی چلا رہا تھا۔ اصغر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں باہر کی طرف بھاگا اور اسلم تیزی سے سے کھڑکیوں پر پاؤں رکھ کر ہاسٹل کی چھت پر جا چڑھا۔ اصغر نے میرا کافی دُور تک پیچھا کیا مگر میں اُس کے ہاتھ نہ آیا اور بھاگ کر اپنے گھر جا پہنچا۔

راجہ کو جب میں نے بتایا کہ میں جیبی کو مار آیا ہوں تو اُس نے مُجھے خوش ہو کر دو سو روپے انعام دیا۔ مگر جب اُس نے سُنا کہ پستول میں کسی دوسرے لڑکے کو دے آیا ہوں تو سخت ناراض ہوا کیونکہ وہ پستول ڈِکّا خان کا تھا۔

اگلے دِن اُس نے مُجھے اسکول بھیجا تا کہ میں اسلم کو بُلا لاؤں۔

میں اسکول پہنچا تو اسلم اپنی جماعت میں بیٹھا تھا۔ اِسے میں نے اشارے سے باہر بُلایا تو وہ پیٹ درد کا بہانہ کر کے بستہ اپنے دوست کے پاس چھوڑ کر میرے ساتھ اسکول سے باہر آ گیا۔

اِسے اپنے ساتھ لے کر میں سیدھا مس فوزیہ کے گھر جا پہنچا۔ وہاں راجو اور ٹِکّا خان نے اِس سے پستول طلب کیا تو اِس نے کہا کہ پستول تو اِس نے پھینک دیا ہے کیونکہ تقی صاحب پوچھ رہے تھے۔

پہلے تو ٹِکّا خان خود اِس پستول کو جوہڑ میں تلاش کرنے کے لیے گیا مگر وہ نہ ملا۔ پھر اُس نے اسلم کو بھیجا مگر معلوم ہوا کہ پستول وہاں سے اسلم کے دوست زُلفی نے نکال لیا ہوا ہے۔

اسلم سے راجو نے زُلفی کا حُلیہ پوچھا اور پھر اسلم کو اُنھوں نے مجبور کیا کہ وہ

اُنہیں زُلفی کا چہرہ دکھائے۔

اُنھوں نے اُس روز اسلم کو خوب مارا کیونکہ اسلم کسی طرح بھی زُلفی کا چہرہ شناخت کروانے پر آمادہ نہیں تھا۔

مار پیٹ سے ڈر کر اسلم نے ایک دِن چُپکے ہی چُپکے راجو کو لے جا کر زُلفی کا چہرہ دِکھا دیا۔ مس فوزیہ کی ماں نے بھی وہ چہرہ دیکھ لیا۔

پھر وہ بُڑھیا وہ مس فوزیہ کی ماں زُلفی کا پیچھا کرنے لگی۔ آخر ایک دِن وہ اندھی بن کر زُلفی کو بازار سے پکڑ کر ساتھ لے آئی اور پھر ٹِکّا خان نے زُلفی کو بھی اسلم کے ساتھ جنگل میں بند کر دیا جو راجو کے ایک دوست کی ملکیت ہے اور ایک عرصہ سے راجو کے قبضے میں ہے کیونکہ اُس کا دوست ولایت جا چکا ہے۔

اِس کے بعد جو کُچھ گُزری وہ آپ کو زُلفی بتا ہی چکا ہے۔"

یہ ساری باتیں سُن کر تھانے دار اظہر علی سخت حیران ہوا اور بولا۔

"تقی صاحب کے گھر چوری کسی نے کی تھی؟"

"اِس کا مُجھے کوئی علم نہیں ہے جناب! یہ مُجھ سے بالکل پوشیدہ رکھی گئی تھیں؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ اِس چوری اور قمرُو کے قتل کی باتیں تمہیں نہیں بتائی گئی تھیں۔"

"جی نہیں! بشیر نے کہا۔

"تمہیں اسلم اور زُلفی سے کیوں کر ہمدردی پیدا ہوئی؟" اظہر صاحب نے

کہا۔

”جی دراصل بات یہ تھی کہ وہ اسلم کو بہت زیادہ مارنے پیٹنے لگے تھے۔ پھر اُنھوں نے اِس کے ابّا کا پتہ پوچھ کر اُسے لکھا کہ وہ تیس ہزار روپیہ اُنھیں دے ورنہ اسلم کو جان سے مار دیں گے۔ اسلم بے چارا میرا دوست تھا۔ اُس نے جیپی کو مارنے میں میری مدد کی تھی۔ جب میں نے اُسے بِلاوجہ پِٹتے دیکھا تو مُجھے اِس پر بہت ترس آیا۔ پھر اِس کے دوست کو پکڑ کر اُنھوں نے جنگل کے مکان میں بند کر کے مارنا شروع کیا تو میں نہ رہ سکا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات اِنھیں وہاں سے نکلنے میں مدد دوں گا مگر راجو پر میرا راز کھُل گیا۔ اُس نے چوبارے میں روٹی کے ٹکڑے دیکھ لیے۔ پانی کی بوتل بھی دیکھ لی۔ بس اِس بات پر اُس نے نیچے آ کر مُجھے اور اسلم کو خوب پیٹا اور پھر ہمیں اُس نے رسّیوں میں جکڑ کر کمرے میں بند

کر دیا۔ مس فوزیہ آج صُبح اِس لڑکی کو بھی کہیں سے پکڑ کر وہاں لے گئی۔ مگر میں تو خود اُن کی نظروں میں مُجرم ہو چکا تھا میں کسی کی کیا مدد کر سکتا تھا۔"

یہ بات سُن کر اظہر علی صاحب نے سلمیٰ سے پوچھا کہ رہ کسی طرح وہاں پہنچی ہے؟

جب اُس نے اپنی آپ بیتی اُنہیں سُنائی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اُنہوں نے اُٹھ کر ہم سب کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے:

"خُدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے میرے بچّو۔ تمہارے والدین کا خُدا جانے کیا حال ہو رہا ہو گا۔ زُلفی بیٹے میں تمہاری بہادری اور جرأت کی داد دیتا

ہوں۔ تُم نے خود ہمّت کر کے اپنی اور اِن بچّوں کی جان بچائی ہے۔ ہم تو شاید کبھی بھی اِن مُجرموں تک نہ پہنچ سکتے۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے ٹیلی فون اُٹھایا اور دلاور روڈ کے قریبی تھانے میں اِطّلاع دی کہ نوازش علی کی بچّی سلمیٰ مل گئی ہے۔ سپاہی کو بھیج کر اُن کے گھر یہ خبر پہنچا دی جائے۔

پھر اُنھوں نے تقی صاحب کے گھر فون کیا اور انہیں بتایا کہ اُن کے دونوں شاگرد محفوظ ہیں اور اِس وقت اُن کے سامنے بیٹھے ہیں۔

اِس کے بعد اُنھوں نے اپنے سپاہیوں کو تیّار ہونے کا حُکم دیا۔ اور بارہ سپاہی منٹوں میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر کمرے کے سامنے آ ٹھہرے۔

اظہر علی صاحب نے اُسی وقت ان سپاہیوں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھایا اور

پھر مُجھے اور بشیر کو ساتھ لے کر وہ مُسلم کالونی کی طرف لپکے۔

رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ گلیاں اور بازار سُنسان پڑے تھے۔ کھمبوں کی روشنیاں زرد زرد تھکی تھکی اور کُملائی ہوئی نظر آتی تھیں۔

اسلم اور سلمیٰ تھانے ہی میں تھے اور ہم دونوں پولیس کے ساتھ بہار شاہ کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

مُسلم کالونی میں پہنچ کر پولیس نے بہار شاہ کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔

اظہر صاحب نے بڑے زور سے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اُس بڑھیا کی گھُر گھُر کرتی آواز سُنائی دی۔

"دروازہ کھولو مائی صاحبہ جلدی کرو۔" اظہر علی نے کہا۔

”کون ہے جو اِس وقت دروازہ کھُلوا رہا ہے۔“ وہ وہیں سے بولی۔

اظہر علی نے ایک بار پھر بڑے زور سے دستک دی اور بولے :

”میں سب انسپکٹر اظہر علی ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

یہ بات سُنتے ہی وہ بُڑھیا لپکتی ہوئی آئی اور دروازہ کھول کر بولی :

”آئیے آئیے تھانے دار صاحب! کہیے کیا حُکم ہے ؟“

”اِن لڑکوں کو جانتی ہیں آپ ؟“

اظہر صاحب نے ہمیں اندھیرے میں سے نکال کر بُڑھیا کے سامنے لا کر کہا۔

”یہ ۔۔۔۔ یہ۔۔۔ جی ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔ میں اُنہیں نہیں جانتی۔“ وہ

بُڑھیا پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"اِسے گرفتار کرلو احمد خان۔" اظہر صاحب نے کہا۔

سپاہیوں نے بڑھیا کو پکڑ کر ہتھکڑی لگا لی۔

اِس کے بعد اظہر علی صاحب سپاہیوں کو لے کر مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ راجو اُس وقت پچھلے کمرے میں سو رہا تھا۔ مس فوزیہ اُس کمرے میں تھی جہاں سے بُڑھیا نکلی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی اور پولیس کے خُوف سے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

راجو کو جگا کر ہتھکڑی لگائی گئی اور مکان کی مکمّل تلاشی لینے کے بعد پولیس نے اِن تینوں کو اپنے ساتھ لیا اور پھر ہم اُسی وقت واپس تھانہ جنوبی جا پُہنچے۔

اِس عرصہ میں تقی صاحب، ترمزی صاحب، اسلم کے ابّا جان جو ابھی تک ترمزی صاحب کے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے اور نوازش علی صاحب سب کے سب تھانے پہنچ چکے تھے۔ اُنھوں نے جب ہمیں دیکھا تو بے حد خوش ہوئے۔

تقی صاحب کا داماد بھی وہیں تھا۔ اُسے اپنی چوری کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی ہمارے گُم ہونے کی۔

سب ہی چہرے جو بُری طرح مُرجھائے ہوئے تھے ایک بار پھر سے کھِل اُٹھے تھے۔ خان صاحب تو اسلم کی بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے۔

ٹِکّا خان کو پولیس نے اسپتال میں معائنے اور علاج کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ کیونکہ اُس کا زخم بہت ہی گہرا تھا۔

خان صاحب تو اسلم کی اس کارگزاری پر بے حد خوش تھے۔ بولے :

"تو اگر اِسے وہیں مار دیتا تو بھی کوئی بات نہ تھی۔ ساری گولیاں اِس کے سینے میں اُتار دیتے تو مجھے خُوشی ہوتی۔ اُس نے مجھ سے تیس ہزار روپیہ طلب کیا تھا اور میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے اُس روپے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے دُشمن اپنی موت آپ ہی مر گیا۔ اب تقی صاحب کے چور اور قمرُو کے قاتل کا بھی پتہ چل جائے گا۔"

"او جی یہی اِس واردات کے مُجرم ہیں۔ یہ آپ ہی آپ اقبالِ جُرم کریں گے۔ دیکھتے تو جائیں۔ مگر صاحب آفرین ہے اِن دونوں لڑکوں پر۔ زُلفی کی تو میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ بہادر ہو تو ایسا ہو۔ کمال ہے صاحب ایسے جی دار لڑکے کبھی نہ دیکھے تھے۔" اظہر صاحب بولے۔

صُبح تک ہم وہیں تھانے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ میرے ابّا بھی وہیں آ پُہنچے۔ وہ پہلے اسکول میں گئے تھے۔ وہاں سے اُنھیں معلوم کہ تقی صاحب تھانے گئے ہوئے ہیں تو وہ پوچھتے پوچھتے وہیں آ پُہنچے مگر مُجھے دیکھ کر اُن کا سارا غم دور ہو گیا۔ اُنھوں نے مُجھے سینے سے لگا کر خوب خوب تسلّیاں دیں پیار کیا اور بولے :

"تجھ پر تو میری زندگی بھی نثار ہے بیٹے۔ یہ دیکھ میں تیرے دُشمنوں کے لیے رقم بھی لے آیا تھا، اور اِن سے لڑنے کے لیے ساری گولیاں بھی اُٹھا لایا تھا مگر اللہ کا شُکر ہے میں نے تُجھے صحیح سلامت پایا۔"

اُن کی آنکھیں فرطِ مسرّت سے بھیگ چُکی تھیں۔

ہم نے اُنھیں ساری باتیں تفصیل سے بتائیں تو وہ بھی بے حد حیران

ہوئے۔

نوازش علی اپنی بچّی کو لے کر اُسی وقت گھر چلے گئے اور بولے :

"مُجھے تو دفتر بھی جانا ہے اور بچّی سخت پریشان ہے۔ اِس کی ماں بھی فکر مند بیٹھی ہوگی۔ مُجھے اجازت دیں۔"

اور ہم سب نے اُنھیں خُدا حافظ کہہ کر وہاں سے رُخصت کیا۔

ناشتہ ہم سب نے وہیں کیا اور پھر اظہر صاحب بولے :

"بھئی وہ سیف کی چابیاں کہاں ہیں ؟"

"جی میرے پاس ہیں وہ۔" میں نے کہا۔

"اچھّا تو چلیں پھر اب ہم اُس مکان کی تلاشی لیتے ہیں جہاں تُم لوگوں کو بند

رکھا گیا تھا۔ "اظہر صاحب بولے۔

اُسی وقت اُنھوں نے جیپ منگوائی اور ہم سب اُس میں سوار ہو کر اُس مکان کی طرف چل دیے جہاں ہم نے زندگی کے سب سے کٹھن لمحے گزارے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں جیپ اُس منحوس مکان کے دروازے پر جا پہنچی۔

پولیس کے چھ سپاہی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اُنھوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔

اور اظہر صاحب پستول تان کر دروازے کی طرف بڑھے جس کا دروازہ ابھی تک کھُلا تھا۔

شیشم کا درخت خاموش کھڑا اُس ویران صحن میں جھانک رہا تھا جس کے بد

بخت ملکین اپنے کیفرِ کردار کو پہنچنے والے تھے۔

غُسل خانے کے سامنے فرش پر خُون جما ہوا تھا۔ یہ ٹِکّا خان کا خُون تھا جو چند پیسوں کے لیے ہماری زندگی ختم کرنے کے در پے تھا۔

کمرے کا دروازہ ابھی تک کھُلا تھا۔

سامنے ٹِکّا خان کا بستر تھا جس پر لحاف یوں پڑا تھا جیسے ابھی وہاں سے کوئی آدمی اُٹھ کر باہر گیا ہے۔

اظہر صاحب نے سارے مکان کو اچھّی طرح گھوم پھر کر دیکھا۔

تقی صاحب اور ترمزی صاحب، میرے ابّا اور اسلم کے ابّا اور تقی صاحب کا داماد یعنی سب کے آدمی یُوں حیرت سے اُس مکان کی ایک ایک شے کو تک رہے تھے جیسے وہ مکان نہیں کسی فرعون کا اہرام تھا

جیسے ابھی ابھی دریافت کیا گیا ہے۔

اُنھوں نے وہ چوبارہ بھی دیکھا جہاں میں نے اتنی ساری اذیّت جھیلی تھی۔

پھر وہ سب لوگ اُس سیف کے سامنے جا ٹھہرے۔

اظہر صاحب چابیوں کا گچھّا ہاتھ میں لے کر اُسے کھولنے لگے۔

ایک کے بعد ایک ساری چابیاں لگتی گئیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آہنی سیف کھُل گیا۔ اب اُس کی درازیں کھُل رہی تھیں۔

ایک دراز چاندی کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔

دوسری دو درازوں میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ نئے نئے نوٹوں کے

کئی بنڈل۔ کئی بنڈل تو ایک ایک سو کے نوٹوں کے تھے۔

وہ روپیہ گِنا گیا تو معلوم ہوا کہ اِن دو درازوں میں ایک لاکھ تیس ہزار روپے کے نوٹ بند تھے۔

چاندی کی اِن اینٹوں پر کسی غیر مُلک کی حکومت کی مُہریں لگی ہوئی تھیں۔

چوتھی دراز جب کھُلی تو اُس میں طرح طرح کی چار پوٹلیاں رکھی تھیں۔ اِن پوٹلیوں میں زیور تھے۔

دوسری پوٹلی جب زمین پر اُنڈیلی گئی تو اُس میں سے جو زیور نکلے انہیں دیکھ کر تقی صاحب کا داماد چیخ اُٹھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔ تو۔۔۔۔ ہمارے زیورات ہیں تھانے دار صاحب۔ یہی ہمارے زیور ہیں۔"

"اچھّا یہ آپ کے زیور ہیں۔ بھئی بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔" اظہر صاحب بولے۔

"ہاں ہاں اظہر صاحب یہی میری بیٹی کا ہار ہے۔ یہ اُسی کی چوڑیاں ہیں۔ نوٹ بھی یہیں ہوں گے۔" تقی صاحب نے کہا۔

جب اُن پوٹلیوں کے نیچے کی دراز کو چابی لگائی گئی تو وہاں سے جو نوٹوں کے بنڈل نکلے انہیں گِننے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ آٹھ ہزار کی وہی رقم تھی جس سے تقی صاحب کا داماد محروم ہو چکا تھا۔

تھانے دار صاحب نے وہ سب چیزیں جو سیف میں سے ملیں اپنے کاغذات میں درج کر کے سارے آدمیوں سے اُن پر دستخط کروا لیے اور پھر وہ سیف اٹھوا کر بڑی مُشکلوں سے ہم نے جیپ میں رکھا اور اُسی وقت ہم

وہاں سے واپس آ گئے۔

۵

کئی دِن تک اظہر صاحب اِس مقدمے کی تیّاری میں مصروف رہے۔

آٹھویں دِن ٹِکّا خان اسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس آیا تو اظہر صاحب نے اُس کا جسمانی ریمانڈ لے لیا۔

وہ کسی طرح یہ بات ماننے کو تیّار نہ تھا کہ اُسی نے تقی صاحب کے ہاں چوری کی ہے۔

راجو بھی انکار کرتا تھا۔

مگر جب اُنہیں وہ سیف دکھایا گیا اور سارے مال کی تفصیل بتائی گئی تو وہ چوکڑی بھول گئے۔ اور اپنے جُرم کا اقبال کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اخباروں میں اِن مُجرموں کی گرفتاری کی خبریں جلّی حروف میں چھپ رہی تھیں اور ہم چاروں بچّوں کی تصویریں بھی برابر وہاں شائع ہوئیں۔

ہم تو سارے شہر میں شیطان کی طرح مشہور ہو چُکے تھے۔

اگرچہ اظہر صاحب نے ہر طرح کی واقعاتی شہادتوں سے مُجرموں کو بتا دیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اپنے جُرم کو چھپا نہیں سکتے ہیں۔ اِس کے باوجود وہ نہیں مانتے تھے کہ قمرُو کو اُنہوں نے قتل کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ چوری تو خیر ہم نے کی ہے مگر قمرُو کے قتل سے ہمارا کوئی تعلّق نہیں ہے۔

اور بشیر یہ کہتا تھا کہ اُس نے کئی بار انہیں قمرُو کے متعلّق پُراسرار باتیں

کرتے دیکھا ہے اور حالات ہر طرح سے یہی ثابت کرتے تھے کہ قمرُو کے قاتل وہی دونوں ہیں مگر پھر بھی وہ کسی طرح یہ نہیں مان رہے تھے۔

اِس عرصہ میں اظہر صاحب کو پولیس کے محکمہ فنگر پرنٹ کی طرف سے ایک رپورٹ ملی جو اُنھوں نے قمرُو کی گردن کے معائنہ کے بعد مرتّب کی تھی۔ اُنھوں نے جن اُنگلیوں کے نشانات واضح کیے تھے وہ سب کے سب ڈِنّگا خان کی اُنگلیوں سے ملتے تھے۔ یہ ایسا ثبوت تھا جسے وہ کسی طرح بھی جھُٹلا نہ سکتے تھے۔

بڑی ہی تگ و دو کی گئی مگر ڈِنّگا خان کسی طرح بھی قتل کی ذمّہ داری اپنے سر لینے پر تیّار نہ ہوا۔ ہم جب بھی تھانے میں اُس کے سامنے جاتے وہ ہمیں ایسی خُونی نگاہوں سے دیکھتا جیسے وہ کھا ہی تو جائے گا۔

آخر اظہر صاحب نے اُس پر اپنے چند خاص نُسخے آزمائے تو وہ مان گیا کہ قمرُو کو اُسی نے قتل کیا ہے مگر وہ اپنا بیان نہیں لکھواتا تھا۔ کہتا تھا کہ ساری باتیں عدالت میں جا کر بتاؤں گا۔

اور پھر ایک دِن ایسا آ ہی پہنچا۔ جب ٹِکّا خان اور راجو کو اظہر صاحب نے عدالت کے کٹھرے میں پہنچا دیا۔

ایک دُنیا اِس مقدمے کی روداد سُننے کے لیے کمرۂ عدالت میں جمع تھی۔ وہاں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

دس بجے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ٹِکّا خان اور راجو، مس فوزیہ اور اُس کی ماں۔ اِن چاروں کو جب کٹھرے میں لایا گیا تو سب لوگ اِن پر آوازے کسنے لگے۔ ٹِکّا خان کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو چکا

تھا۔ چہرہ یُوں مُرجھایا ہوا تھا جیسے صدیوں سے بیمار ہو۔ اُس کی آنکھوں کی وہ سُرخیاں زائل ہو چُکی تھیں جِن کو دیکھ کر لوگ کانپ اُٹھتے تھے۔

وہ سر جھُکائے کھڑا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر یوں اُس کا سارا بدن لرزتا تھا جیسے کوئی خنجر لیے اُس کے سامنے کھڑا ہو۔

اُس نے اپنا جب بیان شروع کیا تو اس کے ایک ایک لفظ پر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

وہ بولا:

"آج میں ان زنجیروں میں جکڑ کر پہلی بار قانون کے سامنے آیا ہوں۔ مُجھے معلوم ہے کہ میرے اور موت کے درمیان فاصلے ختم ہو چُکے ہیں۔ ایک دِن یا دو دِن یا دو مہینے مُجھے جینے کی مہلت مل بھی گئی تو کیا ہو گا۔ اگر یہ

زنجیریں میرے بدن پر نہ ہوتی تو میرے گناہوں کی فہرست میں اضافہ ہی ہوتا۔ اچھّا ہے کہ زُلفی اور اسلم نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ روک لیے۔ اِن سے مُجھے شکوہ ہے تو صرف اتنا کہ اُنھوں نے مُجھے وہیں میرے مکان پر ہلاک کیوں نہ کر دیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو آج میں اِس ہجوم کے سامنے یوں شرمندہ نہ ہوتا۔

میں نے ہوش سنبھالتے ہی بُرے دوستوں کی صُحبت میں بیٹھ کر اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔ مُجھے میرے اُستاد نے جیب کُترنے کا فن سکھایا مگر چند دِن کے بعد طبیعت اُکتا گئی۔

مُجھے مار دھاڑ کی باتیں زیادہ پسند تھیں۔ میں اپنے وہ سارے کارنامے زبان پر نہیں لاؤں گا۔ کیوں کہ وہ ساری باتیں اتنی طویل ہیں کہ سو کتابوں میں بھی نہ سما سکیں گی۔

میں کراچی میں رہتا تھا۔ میں نے تقی صاحب کے داماد اور اُس کی بیوی کا وہاں سے پیچھا کیا۔ میں نے اِن پر اپنی اُنگلیاں بھی آزمائیں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اِن کے پیچھے پیچھے میں اِس شہر میں آ پہنچا۔ یہاں راجو ہی میرا واحد دوست تھا۔ میں نے اِسے اِس نئی اسامی کی بات بتائی۔ مُجھے یقین تھا کہ اِن کے قبضے سے اسّی نوّے ہزار کا سامان تو ضرور ہی نکلے گا۔ یہی سوچ کر میں نے راجو کو اپنا ہم راز بنایا مگر جب اس کی زبانی معلوم ہوا کہ تقی صاحب نے ایک خونخوار کتّا بھی پال رکھا ہے جو کسی طرح بھی رام نہیں ہو سکتا تو میں نے سوچا سب سے پہلے اس کُتّے کو راستے ہٹانا چاہیے۔ کیوں کہ دو بار میں اور راجو رات کو وہاں جا چُکے تھے مگر ہر بار اِس کُتّے نے ہماری کوشش ناکام بنا دی۔ اور پھر راجو نے اِس کُتّے کو مارنے کے لیے اپنے نوکر بشیر سے کام لیا۔ یہ بشیر کی پہلی حماقت تھی کہ اِس نے اُس

اسکول کے ایک لڑکے کو اپنا کام میں ہم راز بنا لیا۔

اُنھوں نے میرے پستول سے کُتّے کو تو مار دیا مگر بشیر میرا پستول اسلم کو دے آیا۔ یہ اِس کی دوسری حماقت تھی جس پر راجو کو بہت زیادہ بھروسہ تھا۔

جبسی کو مار دینے کے بعد مُجھے پستول کی فکر ہوئی۔ میں نے راجو سے کہا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے اسلم کو اپنے ساتھ لے آئے۔

اِس کام میں بشیر نے بڑا اچھّا کردار ادا کیا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اسلم کو اسکول سے لے آیا۔ مگر اِس کے پاس پستول موجود ہی نہ تھا۔ میں نے اِسے واپس بھجوانے کی بجائے اپنے ہی کڑی نگرانی لیا اور اس پر کڑی نگرانی رکھی۔ پستول اسلم نے جس جوہڑ میں پھینکا تھا اُسے میں کئی بار

کھنگال آیا مگر وہ پستول ذوالفقار نے وہاں سے نکال کر گنّے کے کھیت میں دبا دیا۔ اور پھر وہ برابر اِس جوہڑ کی نگرانی کرنے لگا۔

جیپسی کو راستے سے ہٹانے کے بعد اگلا مرحلہ یہ تھا کہ ہم تقی صاحب کے گھر میں کسی طرح داخل ہوں۔ کیوں کہ اِن کے مکان دیواریں بہت اونچی ہیں اور ہم کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام سے کرنا چاہتے تھے۔ پھر ہمیں اِس مکان کے تمام کمروں کا بھی صحیح علم نہ تھا۔ اِس مقصد کے لیے راجو نے اپنے پرانے دوست قمرُو کو ساتھ ملایا۔

قمرُو اِس سے پہلے کئی چوریوں میں راجو کا ساتھ دے چُکا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ رات کو جب صفائی کے لیے وہاں جائے گا تو پچھلا دروازہ جس پر اندر کی طرف پردہ لٹکا رہتا ہے کھُلا رہنے دے گا۔ اُس کی چٹخنی نہیں لگائے گا۔ اُس اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

اس رات وہی ہمیں اپنے ساتھ لے کر تقی صاحب کے مکان پر گیا۔ راجو باہر کھڑا رہا اور میں قمرُو کو ساتھ لے کر اندر گھُس گیا۔

وہ لوگ دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ ہم نے اسٹور روم میں رکھی ہوئی تمام قیمتی چیزیں گٹھڑی میں باندھیں۔

سارا زیور، سارا روپیہ اور قیمتی کپڑے سمیٹ کر ہم باہر آ گئے اور سیدھے قمرُو کے کوارٹر میں جا گھُسے۔ وہاں پہنچ کر قمرُو نے کہا کہ وہ آدھا مال خود رکھے گا۔ میں نے کہا نہیں وہ چوتھے حصّے کا حق دار ہے۔ کیونکہ اِس معاملے میں راجو بشیر میں اور وہ برابر کے شریک ہیں۔

مگر قمرُو نہ مانا۔

اِس پر ہمارے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔ وہ ہمیں پکڑوا دینے کی قسمیں

کھانے لگا۔ لیکن میں ایسی باتیں سُننے کا عادی ہی نہیں تھا۔ میں نے اُس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ اُس کی آنکھیں اُبل آئیں اور ہم اسے ہمیشہ کی میٹھی نیند سُلا کر باہر چلے گئے۔ مگر جب چیمہ صاحب کے خادم گامی نے مُجھے بتایا کہ فلاں فلاں حُلیے کا زلفی نامی لڑکا تھانے میں مُجھے شناخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ لڑکا گامی کے کہنے کے مطابق مُجھے اور راجو کو جوہڑ پر اچھّی طرح پہچان چُکا تھا۔ یہ ایسی مُصیبت تھی جس کا فوری علاج ازبس ضروری تھا۔ میں نے راجو سے کہا کہ وہ زُلفی کو پکڑنے کا فوری بندوبست کرے۔

ہم اسلم کو لے کر شہر میں گھومتے رہے۔ دو بار میں نے بازار میں زُلفی کو دیکھا۔ مس فوزیہ کی ماں کو بھی دِکھا دیا کہ یہ لڑکا ہے جسے ہر قیمت پر قبضہ میں لینے کی ضرورت ہے۔

مس فوزیہ کی ماں ہمارے ہی ٹُکڑوں پر پل رہی ہے۔ اِس نے اندھی کا سوانگ بھر کر زُلفی کو پکڑلیا اور پھر ہم نے اِن دونوں لڑکوں کو لے جا کر جنگل کے مکان میں بند کر دیا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ ان کے والدین بہت امیر ہیں۔ راجو کے کہنے کے مطابق ہم نے ان سے تیس تیس ہزار روپیہ لینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ روپیہ لینے کے باوجود ہم اِن دونوں لڑکوں کو واپس کرنے کا کوئی اِرادہ نہیں رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ ہمارے ٹھکانوں اور ہمارے کارناموں سے آگاہ ہو چُکے تھے۔

ہمارے نوکر بشیر کو خُدا جانے اسلم سے کیوں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اِس نے اُس کے دوست زُلفی کو چوبارے میں جب کھانا پہنچایا تو راجو نے اِسے بھی مُجرم سمجھ کر اسلم کے ساتھ باندھ کر ڈال دیا۔ ہم سے سب سے بڑی حماقت یہ ہوئی کہ ہم نے زُلفی کو رسّیوں میں جکڑا رہنے کی بجائے کھُلا

چھوڑ دیا اور اِس لڑکے کے حوصلے کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ اِس نے نہایت سُوجھ بُوجھ سے کام لے کر ٹوٹی ہوئی چارپائی کا بان نکال کر بڑا ہی مضبُوط رسّا بنایا اور اُس کی مدد سے نیچے اُتر کر وہ درخت کے سہارے صحن میں جا پہنچا۔

میری بد قسمتی یہ ہوئی کہ عین اُس وقت میں پیشاب کرنے کے بعد غُسل خانے میں جا گھُسا۔ جب یہ لڑکا وہاں چھُپ کر کھڑا تھا۔ اِس نے دروازہ بند کر کے مُجھے بے بس کر دیا، اور بڑے ہی استقلال کے ساتھ اِن لڑکوں نے مُجھے بے بس کر دیا۔

وہ لڑکی سلمیٰ اُسی روز ہمارے پاس پہنچی تھی۔

دراصل مس فوزیہ کی ماں نے راجو سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اِسے کوئی لڑکی

لادے گی جس سے وہ شادی کر سکے گا۔ بارہ سال کی معصوم بچّی لے آئی۔ مگر وہ جس کا باپ خاصا امیر آدمی تھا۔ راجو نے اُس سے بھی تیس ہزار روپے کا مطالبہ کرلیا۔

اور یوں ہم اپنے گرد جال کا حلقہ آپ ہی آپ تنگ کرتے چلے گئے۔

وہ روپیہ جو میرے سیف سے نکلا ہے، وہ چاندی اور سونا اور وہ ڈھیر سارے نوٹ میں نے مُختلف لوگوں تجوریوں سے نکالے ہیں۔

میں کراچی، کوئٹہ، حیدر آباد، سکھر اور ملتان کے علاقے سے جو کُچھ چُراتا تھا اِس سیف میں لاکر بند کر دیتا تھا۔ وہ سب کچھ میری ملکیت تھا جس میں سے میں کبھی کبھی راجو کو بھی دیا کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ میرا دستِ راست رہا ہے۔

اگر ہم اِن لڑکوں کے چکّر میں نہ پھنستے تو شاید قانون کا ہاتھ ہم تک کبھی نہ پہنچ

سکتا۔ مگر خُدا کا قانون تو اٹل ہے۔ اس کے ہاں دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ اُس نے میری رسّی دراز تو کی مگر آخر میں اُس کی گرفت ہی گیا۔ وہ کب تک میرے گناہ معاف کرتا۔ قمرُو کے قتل کا بار میرے سر پر ہے۔ اور وہ لوگ جن کو میں نے اُن کی پونجی سے محروم کیا اُن کے نام میں نے الگ لکھ کر پولیس کو دے دیے ہیں۔

میں کسی بھی ہمدردی کا مستحق نہیں ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ مُجھے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں اِن لڑکوں کا شُکر گزار بھی ہوں کہ اُنھوں نے میری گناہ سے آلودہ زندگی کو ایک دم مُختصر کر دیا ہے۔ کسی نہ کسی کا ہاتھ تو میری گردن تک پہنچنا تھا مگر افسوس مُجھے ہے تو صرف اِتنا کہ میں اِن ننّھے مُنّے بچّوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اِن کے ہاتھوں میں خُدا جانے اتنی قوّت کہاں سے آ گئی کہ

میں اِن کے سامنے مٹّی کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

خُدا میرے گناہ معاف کرے۔

آج ہاتھی کو چیونٹی نے ہلاک کر دیا ہے۔

میرے لیے جتنی زیادہ سے زیادہ سزا آپ تجویز کر سکتے ہیں کر دیں۔ کیوں کہ زندگی ایک ہے اور مُجھے اِسی ایک زندگی سے اپنے سارے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر ِٹکّا خان خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد راجو کا بیان قلم بند ہوا۔ اُس نے بھی وہی باتیں بتائیں جو اُس کا اُستاد کہہ چکا تھا۔

پھر بُڑھیا کی باری آئی۔

وہ تو زار زار روتی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ اُسے راجو نے اندھیرے میں رکھا ہے۔

یہی حال مس فوزیہ کا تھا۔

ہم نے بھی جو کُچھ جانتے تھے عدالت کو باری باری بتا دیا۔

٦

قمرُو کے قتل کے الزام میں راجو کے اُستاد ڑکّا خان کو موت کی سزا دی گئی۔

اور اُس کے ساتھی راجو کو دس سال قید با مشقّت کی سزا سُنائی گئی۔

بُڑھیا کو سات سال کی سزا ہوئی۔

مس فوزیہ کو پانچ سال کے لیے جیل میں قیدِ سخت کی سزا دی گئی۔

اور پھر :

سرکار کی طرف سے مُجھے اور اسلم کو بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنے پر ایک ایک ہزار نقد انعام دیا گیا۔

تقی صاحب کے داماد کو اُس کا زیور اور روپیہ واپس مل گیا۔ تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ مُصیبت ٹلی۔

اور پھر ہم ہاسٹل میں امن چین کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس کے بعد پھر کبھی اسلم نے سنیما دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔

ختم شد